شجرِ ممنوعہ
محی الدین نواب

شجر ممنوعہ

یہ انسان کی فطرت ہے کہ اسے
جس کام سے روکا جائے وہی کرتا ہے۔
ایک عورت اور مرد کی کہانی
جو مذہبی، معاشرتی اور انسانی قدروں سے باغی ہو گئے تھے۔
انہوں نے محبت کی ایک جنت بنائی
اور شجرِ ممنوعہ کو اپنے لئے جائز سمجھ لیا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے جیسے پتھر بن گئے۔ ان کے جسم ساکت‘ نگاہیں متحیر اور زبانیں چپ ہو گئیں۔ ایبن کی زبان سے وہ چونکا دینے والی خبر سن کر وہ دونوں حیران بھی ہو رہے تھے اور پریشان بھی۔ سائمن نے دوسرے لمحے اپنے کاندھے سے کدال اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے پوچھا۔ ”ایبن‘ کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“

ایبن دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے فکر‘ پریشانی اور بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سائمن! تم اور پیٹر مجھ سے عمر میں بڑے ہو اور میرے ہم مزاج نہیں ہو۔ شاید اس لیے کہ تم دونوں میرے سوتیلے بھائی ہو۔ میں نے تم لوگوں سے پہلے کبھی مذاق نہیں کیا اور نہ اب کر رہا ہوں۔“

پیٹر نے لکڑی کے گیٹ کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ کیسے ممکن ہے‘ پاپا بوڑھے ہو گئے ہیں۔“

سائمن نے تائید کی۔ ”ہاں۔ میں ہر سال ان کی عمر کا حساب کرتا ہوں‘ وہ پچھتر برس کے ہو گئے ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتے وقت میں اکثر سوچتا ہوں کہ اب اس ہل کی نوک سے پاپا کے لیے قبر کھودنے کا وقت آگیا ہے۔“

پیٹر نے بیزاری سے کہا۔ ”تمہارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا باپ شیطانی عمر لے کر آیا ہے۔ وہ تابوت میں نہیں جائے گا ہمیشہ کسی عورت کی آغوش میں دفن ہوتا رہے گا۔“

ایبن دور اپنے مکان کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔ ”یہی بستی کے دوسرے کسان بھی کہہ رہے تھے کہ وہ بڑھاپے میں جوان ہو گیا ہے۔“

پیٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”وہ عورت بھی بلا کی حسین اور جوان ہو گی جس نے پاپا جیسے پتھر کو موم بنا دیا ہے۔“

”لعنت ہے اس عورت پر!“ ایبن نے غصے سے کہا۔ ”وہ میری مرحوم ماں کی جگہ

چھیننے آرہی ہے۔ یہ زمینیں' جن پر یہ مکان کھڑا ہے' جن پر ہر سال فصلیں اگائی جاتی ہیں' یہ میری ماں اپنے ساتھ لائی تھی۔ اب وہ عورت پاپا کی بیاہتا بن کر قانونی طور سے یہاں کی مالکہ بننے آرہی ہے۔ میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ آہ! میری ماں قبر میں بے چین ہو گی۔"

سائمن نے ناگواری سے کہا۔ "ایبن! جب سے تم نے بولنا سیکھا ہے' تب ہی سے اپنی ماں کا قصیدہ پڑھتے آرہے ہو۔ اب تو وہ قبر میں سو رہی ہے' اسے کیا بے چینی ہوگی۔ بے چینی انہیں ہوتی ہے جو قبر کے باہر زندگی گذارتے ہیں۔ ہمیں دیکھو' ہم برسوں سے ان زمینوں پر ہل چلا رہے ہیں' اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں' محض اس امید پر کہ ایک دن یہ مکان اور زمینیں ہمارے حصے میں آئیں گی۔"

"ہم احمق ہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "ہم اسے باپ سمجھتے ہیں' وہ ہمیں کھیت مزدور سمجھتا ہے۔ ہمیں کھانے کے لیے صرف تین وقت کی روٹیاں اور پینے کے لیے تھوڑی سی شراب دیتا ہے۔ کبھی جیب خرچ کے لیے نقد رقم نہیں دیتا۔ وہ ڈرتا ہے کہ ہم رقم جمع کریں گے اور کیلیفورنیا کی طرف بھاگ جائیں گے۔"

سائمن نے حسرت سے کہا۔ "ہائے کیلیفورنیا.......... وہاں قدم قدم پر سونے کی کانیں ہیں۔ وہاں جو بھی جاتا ہے' بے انتہا دولت مند بن جاتا ہے مگر ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ ہمارے پاس سواری کے لیے گھوڑے نہیں ہیں اور لانچ سے جانے کے لیے کرایہ نہیں ہے۔"

"پاپا نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔" پیٹر نے کہا۔ "مجھے اس بوڑھے سے نفرت ہے۔ ہم نے اس زمین پر جتنی محنت کی ہے اور جتنا ہل چلایا ہے' اتنی کھدائی ہم کیلیفورنیا کی زمین پر کرتے تو آج سونے کے سوداگر بن جاتے۔ یہاں ہمیں کیا ملا؟ کچھ نہیں.......... وہ عورت اب یہاں کی مالکہ کہلائے گی اور ہم بدستور غلام.........."

ایبن نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "میں اس عورت کا گلا گھونٹ دوں گا۔ وہ میری ماں کی جگہ نہیں چھین سکتی.......... ماں.......... ماں تم کہاں ہو؟ یہاں آکر دیکھو' ایک ناگن رینگتی ہوئی تمہاری زمینوں پر آرہی ہے۔"

وہ بچوں کی طرح عالم خیال میں اپنی ماں کو پکارنے لگا۔ وہ پچیس برس کا نوجوان تھا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ جسمانی لحاظ سے نوجوان تھا مگر دماغی لحاظ سے ایک بچہ۔ اس کے

دل و دماغ میں ماں کی ممتا ایک گہرا تاثر چھوڑ گئی تھی۔ اس کا باپ اور اس کے بھائی اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔ اسی کے انداز میں سوچتا ہے اور اسی کے انداز میں بولتا ہے۔ اب تو قبر کے اندر اس بے چاری کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی..........

لیکن ایبن کو اس کی دائمی موت کا یقین نہیں تھا۔ وہ پورے یقین سے کہتا تھا کہ ماں قبر میں بے چین ہے۔ کبھی کبھی راتوں کو وہ میرے کمرے میں آتی ہے اور اپنی زمینوں پر اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہتی ہے۔ دیکھ لینا' ایک دن وہ پاپا سے انتقام لے گی.......... ضرور انتقام لے گی۔"

سائمن اور پیٹر اس کے بچکانہ جذبات کو سمجھتے تھے اور اس کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے تھے لیکن جہاں تک بوڑھے باپ سے انتقام لینے کا سوال تھا' وہ سبھی اس سوال پر غور کرتے تھے۔

"لعنت ہے اس بوڑھے پر.........."

"اللہ کرے کل کا مرتا آج ہی مرجائے۔"

"ہماری جوانی کو گھن لگ رہی ہے۔ اسے ہماری شادی کے لیے سوچنا چاہیے مگر وہ اپنے لیے دلہن لا رہا ہے۔"

"کل صبح وہ اپنی نئی دلہن کے ساتھ یہاں پہنچ جائے گا۔"

"وہ نئی دلہن ہماری کیا ہوئی.......... ماں؟"

"تھو!" ایبن نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "وہ میری ماں کی جگہ نہیں لے سکتی۔ میری زبان اسے کبھی ماں نہیں کہے گی۔ وہ ایک دشمن ہے' جو میری ماں کی جاگیر چھیننے آرہی ہے۔ وہ تم لوگوں سے بھی دشمنوں کا سا برتاؤ کرے گی۔ تم دونوں نے برسوں سے جو محنت کی ہے' وہ رائیگاں جا رہی ہے۔"

سائمن اور پیٹر حسرت سے مکان کی جانب دیکھنے لگے۔

شام کی ڈوبتی ہوئی روشنی میں وہ مکان دھندلا رہا تھا۔ وہ تینوں لڑکے اپنے جابر باپ کی سرپرستی میں برسوں سے وہاں رہتے آئے تھے اور برسوں سے اس مکان اور زمین کے حصے دار بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

مکان کے دائیں بائیں قلنذیر کے سایہ دار درخت دو سپاہیوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ہری بھری پتیوں سے لدی ہوئی شاخیں اس کی چھت پر یوں پھیل گئی تھیں

جیسے وہ دونوں درخت اس مکان پر اپنا اپنا حق جتا رہے ہوں اور اس پر اپنے اپنے بازو پھیلا کر کہہ رہے ہوں.......... یہ میرا حق ہے۔ نہیں' یہ میرا ہے.......... تیز ہوا کی زد میں وہ شاخیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں' لڑتی تھیں' جھگڑتی تھیں اور پتیاں شور مچاتی تھیں.......... یہ میرا ہے.......... یہ میرا ہے..........

سائمن نے جھلا کر کہا۔ "ہم گدھے ہیں۔ اب یہ ہمارا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس کے حصول کے لیے اپنی آدھی جوانی غارت کر دی۔ اب میں کیلیفورنیا جاؤں گا اور چمکتے دمکتے سونے کی کاشت کروں گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہاں ہوں۔" پیٹر نے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ یہاں ہماری جیب میں ایک ڈالر بھی نہیں ہوتا' وہاں سے آنے والے کہتے ہیں کہ ہم اپنے بازوؤں کی محنت سے روزانہ مٹھی بھر سونا حاصل کر سکتے ہیں۔"

وہ تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قلندیز کے سائے میں جانے لگے۔ ایبن نے کہا۔ "جب تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں پاپا کے خلاف تنہا ایک محاذ بناؤں گا اور ایک دن اپنی ماں کی زمینیں حاصل کر کے ہی رہوں گا۔"

"کتا کتے کو کاٹتا ہے۔ بیٹا باپ کو اور باپ بیٹے کو کاٹے گا۔"

وہ دونوں ایبن پر قہقہے لگانے لگے۔ پیٹر نے شجر کے سائے میں آ کر کہا۔ "تم باپ بیٹے ان درختوں کی طرح اپنی جڑیں مضبوط کرتے رہنا۔ جب ہم چلے جائیں گے تو ہمیں تم دونوں سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔"

سائمن نے زمین پر ٹھوکر مار کر دھول اڑاتے ہوئے کہا۔ "میرا بس چلے تو آج ہی اس زمین کی قید سے آزاد ہو جاؤں۔ کل صبح پاپا کے آنے سے پہلے ہی چلا جاؤں.......... مگر میری جیب خالی ہے۔"

پیٹر نے دانت پیس کر کہا۔ "پاپا نے ہمیں کمزور بنا کر رکھا ہے۔ وہ بوڑھا جانتا ہے کہ ہماری جیب میں پیسے آتے ہی ہمارے پر نکل آئیں گے۔"

ایبن نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں تمہیں پر لگا سکتا ہوں۔ تم دونوں اُڑ کر کیلیفورنیا پہنچ جاؤ گے۔"

"تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو؟" پیٹر نے ناگواری سے پوچھا۔

"نہیں!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "تم دونوں کل صبح دریائی راستے سے بڑے آرام

کے ساتھ لانچ میں بیٹھ کر جا سکتے ہو۔ میں تم دونوں کو تین تین سو ڈالر دوں گا۔"

وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ایبن ہمیشہ بچوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ یہ بھی بچوں کی سی باتیں تھیں۔ بھلا اس احمق کے پاس چھ سو ڈالر کہاں سے آجاتے؟ لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اور کہنے کے انداز میں استحکام تھا۔ سائمن نے پوچھا۔

"کیا تم ہمیں چھ سو ڈالر کے خواب دکھا رہے ہو؟ اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آجائے گی؟"

ایبن نے جواب دیا۔ "پاپا نے یہ رقم ہم سے چھپا کر رکھی ہے۔"

"کہاں؟" ان کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ میری ماں نے ایک دن چھپ کر دیکھ لیا تھا کہ پاپا نقدی کہاں چھپایا کرتے ہیں۔ ماں نے مجھے بھی وہ جگہ دکھا دی تھی۔ بہرحال میں ایک شرط پر وہ رقم دے سکتا ہوں۔"

سائمن اور پیٹر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر سائمن نے کہا۔ "یہ زمین برسوں سے ہمارا خون چوس رہی ہے' ہم اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے تمہاری ہر شرط مان لیں گے۔"

"تم دونوں کو ایک کاغذ پر تحریری معاہدہ کرنا ہو گا کہ مجھ سے تین تین سو ڈالر لینے کے بعد یہاں واپس نہیں آؤ گے۔ اگر آؤ گے تو میری ماں کی زمینوں سے اپنا حصہ نہیں مانگو گے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

"ہوہوہو۔ ہم اس زمین پر ہزار بار لعنت بھیجتے ہیں۔"

"ہاہاہا۔ اس زمین نے ایک طوائف کی طرح ہماری آدھی جوانی کھالی ہے۔"

"ہوہوہو۔ ہاہاہا۔ چھ سو ڈالر میں یہ سودا سستا ہے۔ کتا کتے کو کاٹتا ہے۔ تم باپ بیٹے آپس میں لڑتے رہو۔ لاؤ ہماری رقم نکالو۔"

"پہلے معاہدہ!" ایبن نے سخت لہجے میں کہا۔

"ابھی لو۔ آؤ' ہم ابھی کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔"

وہ تینوں پورچ کی طرف بڑھنے لگے۔ پیٹر نے کہا۔ "ایبن! تم چھپے رستم نکلے۔ ہم

سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہارے جیسا احمق لڑکا اتنی بڑی رقم چھپائے بیٹھا ہے۔ اب پتہ چلا کہ منی تمہیں کیوں پھانس رہی ہے۔"

"میں اسے پسند کرتا ہوں۔" ایبن نے کہا۔

"کبھی میں بھی اسے پسند کرتا تھا۔" سائمن بولا۔ "پھر میں نے اسے چھوڑ دیا' کیونکہ پاپا اس کے پاس جانے لگے تھے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" ایبن نے غصے سے کہا۔

سائمن ہنسنے لگا۔ "تم ناراض کیوں ہوتے ہو۔ عورت اور زمین کسی ایک کی مٹھی میں نہیں رہتی۔ کبھی مرد کی مردانگی اور کبھی ڈالر کی طاقت اسے اِدھر سے اُدھر کر دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منی تمہاری زندگی کی پہلی عورت ہے؟"

ایبن نے بدستور غصے سے کہا۔ "تم سے مطلب؟ تم دونوں اپنے کام سے کام رکھو۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ سائمن نے زینے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔ "رقم کہاں ہے؟"

ایبن نے جواب دیا۔ "تم اپنے کمرے میں جا کر کاغذ اور قلم تیار رکھو' میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ دونوں سیٹیاں بجاتے اور گنگناتے ہوئے اوپری منزل کی طرف جانے لگے۔

ایبن خاموش کھڑا ہوا انہیں گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس نے ڈرائنگ روم میں آکر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کچن میں آیا۔ کچن کے دروازے کو بھی اس نے اندر سے بند کر دیا۔ وہاں سے چلتا ہوا وہ کب بورڈ کے پاس آیا۔ اس کب بورڈ کے نیچے پختہ فرش پر ایک چوکور زمین دوز تجوری تھی' جس میں رکھے ہوئے چھ سو ڈالر سائمن اور پیٹر کو دودھ کی مکھی کی طرح اس کی ماں کی زمین سے دور پھینک سکتے تھے۔

وہ زور لگا کر آہستہ آہستہ بورڈ کو ایک طرف ہٹانے لگا۔

☆======☆======☆

صبح ہو رہی تھی۔

سائمن اور پیٹر اپنے کاندھوں سے سفری بیگ لٹکائے مکان سے باہر آئے کچن کی چمنی

سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر پیٹر نے حقارت سے کہا۔ "ایبن چولہے ہانڈی میں مصروف ہے۔ وہ زمینوں کے لالچ میں ساری زندگی یہاں باورچی بنا رہے گا۔"

سائمن نے قلنذیر کے درختوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس درخت کے سائے میں رہ کر نت نئی خواہشات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم نے چاہا کہ یہ زمینیں ہمیں مل جائیں' یہ مکان ہمارا ہو جائے۔ کھلیان کا تمام اناج' باڑے کے تمام مویشی ہمارے حصے میں آجائیں اور...... اور جوانی کی کڑی راتیں منی جیسی خوبصورت عورت کی آغوش میں گذرتی رہیں۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے...... مگر کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ پھر بھی ہم خسارے میں نہیں رہے۔ ہماری جیبوں میں تین تین سو ڈالر ہیں اور کیلیفورنیا کا راستہ آسان اور مختصر ہو گیا۔ ایبن کو جہنم میں جانے دو۔ اب ہمیں اپنی منزل کی طرف چلنا چاہیے۔"

وہ دونوں گیٹ کی طرف بڑھنے لگے لیکن چند قدم چلنے کے بعد رک گئے۔ سامنے ان کا باپ افریم کیبوٹ اپنی نئی بیوی ابی پٹنیم کے ساتھ گیٹ سے داخل ہو رہا تھا۔ کیبوٹ اپنے جوان بیٹوں کی طرح مضبوط اور قد آور نظر آرہا تھا۔ چھہتر برس کی عمر میں اس کی کمر کمان ہو جانا چاہیے تھی مگر ابھی وہ صرف شانوں کی طرف سے جھکا تھا۔ شاید اندر سے کمزور ہو مگر اوپر سے ایک تناور درخت کی طرح مضبوطی سے کھڑا ہوا تھا۔ چہرے پر پتھر کی سی سختی اور نگاہوں میں بے مروتی اور سفاکی تھی۔

ابی پینتیس برس کی ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ درمیانہ قد' بھرا بھرا جسم' بیضوی چہرہ...... اور پیاسی آنکھیں دیکھنے والوں کو پہلی ہی نظر میں مقناطیس کی طرح کھینچ لیتی تھیں۔ بوڑھے خاوند کے سامنے اس کی عمر آپ ہی آپ کم ہو گئی تھی۔ وہ جوان عورت کی بجائے ایک دوشیزہ نظر آرہی تھی اور اپنی جوان بیوی کے سامنے وہ اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا اور کھلے ہوئے پھول مہکتے پہلو میں مرجھائے ہوئے کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

اس نے بوڑھی مسکراہٹ سے کہا۔ "ابی! یہ ہمارا گھر ہے۔"

وہ مکان کی جانب خوشی سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "اوہ۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں اس مکان کی مالکہ بن کر آئی ہوں۔"

کیبوٹ نے کہا۔ "یہ تمہارا اور میرا گھر ہے۔ برسوں سے ویران پڑا ہے۔ گھر کوئی

سا ہو‘ عورت کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔“

ایبی نے جواب دیا۔ ”عورت بھی گھر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی.......... ارے وہ دو نوجوان کون ہیں۔ وہ دیکھو‘ ادھر کھڑے ہوئے ہیں۔“

کیبوٹ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ ”وہ میرے لڑکے ہی ہوں گے۔ چہرے صاف نظر نہیں آرہے ہیں۔“

سائمن نے بوڑھے کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پاپا! میں سائمن ہوں۔“

”اور میں پیٹر ہوں۔“

وہ اپنی بیوی کے ساتھ ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”بیوقوفو! یہاں کیا کر رہے ہو؟ کھیتوں پر کیوں نہیں گئے؟“

پیٹر نے سائمن کو دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہاری دلہن کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے ہیں۔“

”اچھا تو تم لوگوں کو پہلے ہی خبر مل گئی ہے۔ اچھی بات ہے۔ یہ تمہاری نئی ماں ہے۔“

”ماں!“ سائمن نے زمین پر تھوک دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی پیٹر نے بھی زمین پر تھوکا۔ ایبی کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کی گردن اکڑ گئی‘ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی اور وہ دونوں کو جلانے کے لیے بولی۔

”یہ میرا گھر ہے۔ میں ذرا دیکھوں کہ یہ اندر سے کیسا ہے۔“

وہ ایک شان بے نیازی سے پورچ کی طرف جانے لگی۔ پیٹر نے کہا۔ ”ایبن کچن میں ہے۔ اس کے سامنے یہ نہ کہنا کہ یہ تمہارا گھر ہے۔ وہ تمہیں کچا کھا جائے گا۔“

”یہاں جو چیز میری ہے‘ میں اسے اپنی ہی کہوں گی۔ مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔“

کیبوٹ نے کہا۔ ”ایبن سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرح احمق اور نرم طبیعت کا لڑکا ہے۔“

ایبی مکان کے اندر چلی گئی۔ سائمن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نرم طبیعت.......... ہاہاہا.......... پہلے ہم بھی اسے احمق سمجھتے تھے مگر وہ تو چھپا رستم نکلا۔ وہ اندر سے بہت گہرا ہے۔ ہمیں یقین ہے پاپا! وہ ایک دن تمہیں تگنی کا ناچ نچائے گا۔“

کیبوٹ نے ڈانٹ کر کہا۔ ”بکواس مت کرو‘ کام پر جاؤ۔“

سائمن نے لاپروائی سے مکان کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”اچھا تو یہ ہے ہماری نئی ماں۔ کمال ہے پاپا! اس عمر میں اسے کہاں سے کھود کر نکالا ہے؟“

وہ اور پیٹر ہنسنے لگے‘ پھر پیٹر نے کہا۔ ”اس عورت کو بھی مویشیوں کے باڑے میں باندھ کر رکھو۔ عورت اور جانور کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب بھاگ جائے۔“

وہ دونوں منہ پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگانے لگے۔ کیبوٹ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم لوگوں نے صبح ہی صبح بہت زیادہ پی لی ہے؟“

”ہاں۔ بوڑھے پاپا! ہمیں نشہ ہے۔ آزادی کا نشہ۔ آج سے ہم آزاد ہیں۔ تم نے ہمارے پاؤں میں جو بیڑیاں ڈالی تھیں‘ وہ ہم نے کاٹ دی ہیں۔“

وہ دونوں پاؤں اٹھا اٹھا کر اچھلنے لگے اور قہقہے لگانے لگے۔

”ہم کیلیفورنیا جا رہے ہیں‘ جہاں سونا ہی سونا ہے۔“

”ہم مٹھی بھر سونے سے تمہیں اور تمہاری زمینوں کو خرید سکتے ہیں۔“

سائمن خوشی سے ایڑی پر گھوم گیا۔ پیٹر ایک ٹانگ اٹھا کر ہوا میں ٹھوکر مارتا ہوا بولا۔

”ہم ریڈ انڈین کی طرح آزاد ہیں۔“

وہ دونوں کیبوٹ کے چاروں طرف جنگلیوں کی طرح ناچنے لگے۔ کیبوٹ جھلا کر پلٹ پلٹ کر انہیں غصے سے دیکھ رہا تھا۔

”ہم جنگلیوں کی طرح آزاد ہیں۔ شکر کرو ہم تمہیں نہیں لوٹ رہے ہیں۔“

”جنگلی حملہ آوروں کی طرح تمہارے گھر کو آگ نہیں لگا رہے ہیں۔ تمہاری نئی دلہن کو اٹھا کر نہیں لے جا رہے ہیں۔ ہمیں اتنی فرصت نہیں ہے‘ کیونکہ ہم کیلیفورنیا جا رہے ہیں..........“

کیبوٹ نے چیخ کر کہا۔ ”رک جاؤ۔ بکواس بند کرو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں تم دونوں کو باندھ کر پاگل خانے پہنچا دوں گا۔“

”ہاہاہا.......... ہمارا خون چوسنے والے پاپا۔“

”ہماری کھال کھینچنے والے پاپا اب ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔ خدا حافظ!“

”جہنم میں جاؤ۔ دور ہو جاؤ میری نظر سے..........“

کیبوٹ گھونسہ تان کر مارنے کے لیے دوڑا لیکن پھر ٹھٹک گیا۔ سائمن اور پیٹر زمین

پر سے پتھر اٹھا رہے تھے۔

"ایک ماں!" سائن نے ایک پتھر کھینچ کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر مارا۔ کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

"دوسری ماں!" پیٹر نے دوسرے پتھر سے کھڑکی کا نشانہ لیا۔

"تیسری ماں!" سائن نے تیسرا پتھر پھینکنا چاہا۔ کیبوٹ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا ان کی جانب لپکا۔ وہ دونوں گیٹ کی طرف بھاگنے لگے۔

"اُلو کے پٹھو! اگر تم میرے ہاتھ آجاؤ تو میں تمہاری ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں.........."

لیکن وہ دوڑتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے تھے۔ کیبوٹ زمین سے پتھر اٹھا اٹھا کر نشانہ لے رہا تھا مگر وہ پتھروں کی پہنچ سے بھی دور نکل گئے۔

ابی نے اوپری منزل کی ایک کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ "تمہارے دونوں بیٹے اول درجے کے بدتمیز ہیں۔ اچھا ہوا کہ میرے آتے ہی یہ بلائیں دور ہو گئیں۔"

کیبوٹ نے پلٹ کر دیکھا۔ "میں حیران ہوں کہ انہیں کیلیفورنیا جانے کے لیے رقم کہاں سے مل گئی؟ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میری عدم موجودگی میں اناج یا مویشی بیچ کر رقم حاصل کی ہو۔ تم آرام کرو، میں باڑے میں جا کر مویشیوں کو گنتا ہوں۔ اناج کا بھی حساب کرنا ہوگا.........."

وہ بڑبڑاتا ہوا مکان کے بائیں طرف جانے لگا۔

ابی اوپری منزل سے اتر کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ پاس ہی کچن سے مسالے دار سالن بھوننے کی مہک آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

ایبن کام میں مصروف تھا۔ اسے کسی کی آمد کا احساس نہیں ہوا۔ ابی ایک لمحے کے لیے دروازے پر ٹھٹک گئی۔ کیبوٹ نے اسے اتنا ہی بتایا تھا کہ ایبن اس کا سب سے چھوٹا لڑکا ہے۔ لفظ "چھوٹا" سے اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہ بہت ہی کم عمر ہوگا مگر وہ تو اچھا خاصا قد آور جوان تھا۔ چوڑے شانے اور مضبوط بازو بتا رہے تھے کہ وہ بچہ نہیں ہے۔ بوڑھے کیبوٹ کی طرح کمزور بھی نہیں ہے۔ وہ جوانی کی دھوپ میں جلتی ہوئی چٹان ہے، جس کے سائے میں عورت بھی جل جاتی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اس کی جانب یوں کھنچتی چلی گئی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ ایبن اس کی آہٹ سن کر پلٹ گیا۔ پھر ایک عورت کو اپنے قریب دیکھتے ہی حیرت سے اچھل کر

ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اسے فوراً ہی پوچھنا چاہیے تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ لیکن اس کی قوت گویائی کچھ دیر کے لیے جواب دے گئی تھی۔ وہ کچھ ایسی حسین تھی اور اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ ایبن کی زبان چپ ہو گئی اور دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم ایبن ہو نا؟ میرا نام ابی ہے۔ تمہارے پاپا نے مجھ سے شادی کی ہے۔"

اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

"نہیں۔ تم جھوٹ بولتی ہو۔"

وہ بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔ "تمہارے پاپا نے کہا تھا کہ تم احمق.........."

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہنسنے لگی۔

"تم اپنے پاپا کی بات کا برا نہ مانو۔ بڑھاپے میں وہ خود احمق بن گئے ہیں۔ یہی دیکھ لو کہ مجھے بیوی کے رشتے میں باندھ لائے ہیں لیکن میں تمہارے ساتھ ماں بیٹے کا جھوٹا ناٹک نہیں کھیل سکتی۔ تم اتنے لانبے چوڑے ہٹے کٹے نوجوان ہو کر تمہیں بیٹا کہنا ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ دنیا والے روایتی رشتوں سے خوش ہوتے ہیں لیکن عمر کے تقاضے ان رشتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ رشتہ وہی درست ہوتا ہے جو فطرت کے عین مطابق ہو۔ ہم یہاں دوست بن کر رہیں گے۔ تمہیں دوست بنا کر میں یہاں سے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہوں۔"

وہ تلخی سے بولا۔ "تم مجھ سے بہت کچھ چھیننے آئی ہو۔ تم میری دشمن ہو۔"

ابی نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں دیکھنے سے پہلے میں بھی یہ سوچ کر آئی تھی کہ تم میرے دشمن ہو۔ تمہارے پاپا نے بتایا تھا کہ تم اپنی ماں سے بہت محبت کرتے ہو اور اس کی جگہ مجھے برداشت نہیں کرو گے۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو میں بھی کسی سوتیلی ماں کا وجود برداشت نہیں کرتی مگر اب تو جھگڑا ہی ختم ہو گیا، تم مجھے اپنی ماں کی جگہ نہیں دیکھنا چاہتے اور میں بھی اس رشتے کو پسند نہیں کرتی ہوں۔

ایبن! تم مجھ سے زیادہ دنوں تک نفرت نہیں کر سکو گے، میری ماں بھی بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ ہم دونوں کے حالات ایک جیسے ہیں۔ میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں، مصیبتوں کا ایک سمندر پار کیا ہے میں ایک تنہا یتیم لڑکی تھی۔ دوسروں کے گھروں

میں کام کر کے زندگی گزارتی تھی پھر میری شادی ایک ایسے شرابی سے ہو گئی جو دن رات نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔ مجھے گالیاں دیتا تھا' مارتا تھا اور مجبور کرتا تھا کہ میں دن رات کام کر کے اس کے لیے شراب کی بوتلیں مہیا کروں۔ اچھا ہوا کہ وہ جلد ہی مر گیا اور مجھے اس سے نجات مل گئی۔ پھر آزاد رہ کر دوسروں کے گھروں میں کام کرنے لگی۔

میرے دل میں بھی ارمان تھے۔ میں بھی سوچتی تھی کہ دوسری عورتوں کی طرح میرا بھی ایک گھر ہو اور اس گھر کو میں جنت کا نمونہ بنا کر رکھوں۔ زندگی کی کتنی ہی سردیاں اور گرمیاں جھیل کر مجھے یہ گھر نصیب ہوا ہے۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لیے میں نے عمر کا حساب نہیں کیا اور ایک بوڑھے کا ہاتھ تھام لیا۔ شادی کے بعد پتہ چلا کہ جس پیار کی تلاش میں عورت بھٹکتی ہے' وہ پیار مجھے نہ ملا تو میں اپنے گھر کو جنت کا نمونہ نہیں بنا سکوں گی۔"

وہ ایک گھر کے لیے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کر رہی تھی اور اپنی داستانِ غم کچھ ایسے درد بھرے انداز میں سنا رہی تھی کہ ایبن ذرا دیر کے لیے متاثر ہو گیا.......... یہ حقیقت ہے کہ حسین عورت کے آنسو بڑی جلدی متاثر کرتے ہیں۔

ایبی نے اس کے بالکل قریب آ کر کہا۔ "میری خواہش کوئی انوکھی خواہش نہیں ہے۔ ہر عورت گھر بسانے کے خواب دیکھتی ہے۔ مجھے یہ گھر مل گیا ہے۔ اب یہاں صرف ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے محبت.........."

آخری فقرہ کہتے وقت اس کی آواز سرگوشی میں ڈوب گئی۔

اچانک ہی ایبن کو خیال آ گیا کہ وہ اس کی ماں کی دشمن ہے' اس نے جھڑکنے کے انداز میں کہا۔ "مجھ سے دور رہو۔ چالاک عورت' تم نے میری ماں کی جائیداد پر قبضہ جمانے کے لیے بوڑھے پاپا سے شادی کی ہے اور اب اپنی زندگی کی جھوٹی داستان سنا کر میری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی ہو لیکن میں پاپا کی طرح احمق نہیں ہوں۔"

اس کی بات ایبی کے دل پر ایک گھونسے کی طرح لگی۔ وہ سچ مچ اس کی ہمدردی اور محبت حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کی کتاب کھول رہی تھی اور وہ محبت کے دو بول بولنے کی بجائے اسے جھوٹی اور مکار عورت کہہ رہا تھا۔

"تم سچ مچ احمق ہو۔" وہ اپنی ناقدری پر تلملا گئی۔

ایبن نے حقارت سے کہا۔ "احمق کون ہے' یہ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں پاپا

سے کہوں گا کہ تم اسے بوڑھا اور بے وقوف کہتی ہو۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ "اور میں اس سے کہوں گی کہ تم مجھے اپنے بوڑھے باپ کے خلاف بھڑکا رہے ہو۔ یاد رکھو بوڑھے آدمی پر اس کے بیٹے کا نہیں' اس کی جوان بیوی کا جادو چلتا ہے۔"

"مکار عورت.........." وہ غصے سے یوں آگے بڑھا جیسے اس کا گلا گھونٹ دے گا لیکن بالکل قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اسے اچانک ہی ایک خوف سا محسوس ہوا کہ اسے چھوتے ہی جل جائے گا۔ اس کے ہاتھ گردن تک پہنچیں گے مگر ریشمی بدن سے چپک کر رہ جائیں گے۔ اسے جھجکتے دیکھ کر ایبی نے اشتعال دلانے کی کوشش کی۔

"یہاں کی زمینیں میری ہیں' یہ میرا گھر ہے اور یہ کچن اور یہ بالشت بھر کی زمین' جہاں تم کھڑے ہو' سب کی سب میری ہیں۔"

"یو شٹ اپ!" وہ حلق کے بل چیخ کر بولا۔ وہ بھی برابر بولتی گئی۔

"اور وہ اوپری منزل کی خوابگاہ میری ہے.......... اور وہ ملائم بستر میرے لیے ہے اور میرے ملائم جسم کی حرارت.........."

اس نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ ایبن کے خون کی حرارت اور گردش اچانک ہی تیز ہو گئی۔ وہ تیزی سے پلٹ گیا اور لانبے لانبے ڈگ بھرتا ہوا کچن سے باہر جانے لگا۔ ایبی کی آواز نے اس کا پیچھا کیا۔

"یاد رکھو ایبن! تم صرف دوست بن کر یہاں سکون سے رہ سکو گے.........."

ایبن ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ پھر ڈرائنگ روم سے کاریڈور اور کاریڈور سے باہر پورچ میں آ گیا.......... بوڑھا کیبوٹ مویشیوں کے باڑے سے واپس آ کر گیٹ کے پاس رک گیا تھا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے سائمن اور پیٹر کو کوس رہا تھا۔

"خدایا! ایسی ناخلف اولاد پر اپنا بدترین عذاب نازل کر۔ وہ کم بخت فصل کی کٹائی پر ساتھ چھوڑ گئے ہیں.........."

"اونہہ۔" ایبن آگے بڑھتا ہوا بڑبڑایا۔ "جیسا بیج ہو گا' ویسی ہی فصل ہو گی۔ انہیں کوسنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر کیبوٹ پلٹ گیا اور اسے دیکھ کر بولا۔ "کیا بک رہے ہو'

کھیتوں پر کیوں نہیں گئے؟"

"وہ دونوں جا چکے ہیں' میں تنہا کام نہیں کر سکتا۔ تمہیں بھی چلنا ہو گا۔"

"ہاں چلوں گا۔ مجھے بوڑھا نہ سمجھو' میں دس جوانوں کا کام تنہا کر سکتا ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ گیٹ سے باہر جانے لگا۔ "اونہہ! تنہا کام نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسی جوانی پر' کون تمہیں جوان کہے گا۔ تم آدھے مرد ہو اور آدھے عورت............"

"کون مجھے جوان کہے گا؟" ایبن نے گھوم کر کچن کی جانب دیکھا۔ "ہاں کوئی اسے جوان سمجھنے والی ہستی ہے۔ کہتی ہے میں لانبا چوڑا ہٹا کٹا نوجوان ہوں.........."

اس نے دور جاتے ہوئے بوڑھے کو دیکھا اور اپنی برتری کے احساس سے مسکرانے لگا۔

☆=========☆=========☆

وہ گرمی کی ایک سہ پہر تھی۔ سورج اپنی دھوپ سے زمین کو گرما رہا تھا۔ ابی پورچ کے قریب قلنذیر کے سائے میں بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر موسم گرما کا ہلکا' باریک اور مختصر سا گاؤن تھا۔ اس کی آنکھیں غنودگی کے طور پر نیم وا تھیں۔ دور سے دیکھنے پر دھوکا ہوتا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔

ایبن نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے کچھ دیر تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اکثر اس سے کترایا کرتا تھا۔ کبھی سامنا ہوتا تو منہ گھما کر اس سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے چلا جاتا۔ ہمیشہ اس کے اندر ایک جنگ جاری رہتی تھی کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ وہ اپنے آپ سے لڑتا تھا مگر کبھی کبھی' دور دور سے نظریں بچا کر دیکھنے پر بھی مجبور ہو جاتا تھا۔

طلوع آفتاب کو' کھلے ہوئے پھول کو اور نگینے کی طرح چمکتے ہوئے حسن کو ہر آنکھ دیکھتی ہے۔ ایک اوباش میخوار بھی دیکھتا ہے اور ایک عابد پرہیزگار بھی دیکھتا ہے۔ آنکھ کو بینائی اور نظارے کو پذیرائی' قدرت کے قانون نے دی ہے۔ اس سچائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ایبن اس سچائی سے کتراتا تھا مگر چھپ کر دیکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہ سوچ کر دیکھ رہا تھا کہ دور قلنذیر کے سائے میں ابی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی ہے۔ اگر وہ نظر بھر کر دیکھ لے تو اس دشمن عورت کو خبر نہ ہو گی......... اور اگر خبر ہو گی تو میرا کیا بگاڑ لے

گی۔ میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں.......... میں تو قلنذیر کے سائے کو دیکھ رہا ہوں۔ ہاہا' اس شجر کے سائے میں بھٹکی ہوئی نگاہوں کو اور تپتے ہوئے جذبوں کو آرام آجاتا ہے۔

ابی ادھ کھلی آنکھوں سے اس چور تماشائی کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ عورت فلسفی نہیں ہوتی' دانشور نہیں ہوتی' اس کی تخلیق آدم کے پہلو سے ہوئی تھی' اس لیے آدم شناس ہوتی ہے اور اسی لیے ابی دور کھڑکی سے جھانکنے والے ابنِ آدم کو دیکھ رہی تھی' بلکہ سمجھ چکی تھی۔

پھر ایبن کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ابی کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ وہ بے چینی سے خالی کھڑکی کو دیکھنے لگی۔ کہاں گیا؟ وہ کہاں چلا گیا؟ ذرا دیر کی بے چینی تھی۔ ایبن پورچ کی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ابی سے نظریں ملتے ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اچھا تو وہ جاگ رہی تھی۔ تغافلِ عارفانہ سے میری نگاہوں کی چوری دیکھ رہی تھی۔ مجھے احمق بنا رہی تھی۔

وہ غصے اور نفرت سے منہ پھیر کر جانے لگا۔ ابی کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ جھلا کر پلٹ گیا اور اس کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔ "تم کس پر ہنس رہی ہو؟"

"تم پر۔ تم جان بوجھ کر مجھے نظرانداز کرتے ہوئے جا رہے ہو۔"

"اونہہ! تم کون سی حور پری ہو کہ تمہیں آتے جاتے دیکھتا رہوں۔"

"میں ہوں۔ میں زیادہ نہ سہی' اس حد تک خوبصورت ضرور ہوں کہ کوئی مجھے دیکھے۔ تم فطری تقاضوں سے انکار کر رہے ہو' اپنے آپ سے لڑ رہے ہو' اپنے دل کو سمجھا رہے ہو کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ایبن؟ تم سورج کی تپش محسوس کر رہے ہو' اس لیے کہ وہ جل رہا ہے۔ اس کی گرمی تم تک پہنچ رہی ہے۔ میں بھی جل رہی ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے بدن کی آنچ ایک مرد تک نہ پہنچے۔ تم فطرت کے خلاف باتیں کر رہے ہو۔

"یہ قلنذیر کا درخت زمین کی تہہ میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ آندھی طوفان کا سہارا لے کر خود کو زمین کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ یہ ہوا کی زد میں اِدھر سے اُدھر مچلتا ہے۔ اس کی شاخیں تڑپتی ہیں' پتیاں شور مچاتی ہیں۔ یہ جتنی جدوجہد کرتا ہے' اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے' پھیلتا جاتا ہے۔ اسی طرح تمہارے دل میں جو چور جذبات جکڑے ہوئے ہیں' تم آندھی طوفان بن کر انہیں مٹانے کی کوشش کرو' پھر بھی وہ بڑھتے جائیں گے' پھیلتے

پھولتے جائیں گے۔ تم فطرت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ آج نہیں تو کل تمہیں اس حقیقت کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا۔"

وہ گم صم کھڑا رہا۔ اس کی باتیں سن کر اپنی باطنی کمزوری کو ٹٹولتا رہا۔ پھر اس کے خاموش ہوتے ہی اس کی باتوں کا سحر ٹوٹ گیا۔ وہ سنبھل کر بولا۔ "تم.......... تمہاری یہ باتیں اگر پاپا نے سن لیں تو.......... تو.......... مگر تمہیں اس کی کیا پرواہ ہے۔ تم اسے بھی احمق بنا رہی ہو۔"

"جو احمق ہے' وہ احمق ہی رہے گا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو میں صدق دل سے تمہیں دوست بنانا چاہتی ہوں۔"

"مرد کی دشمنی اتنی مہنگی نہیں پڑتی جتنی کہ عورت کی دوستی پڑتی ہے۔ تمہاری دوستی کو دور سے سلام.........."

وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔

"ایبن!" اس کے پکارنے میں ایسی التجا' ایسی مٹھاس تھی کہ قدم رک گئے۔ وہ ناگواری سے بولا۔

"مجھے جاتے وقت ٹوکا نہ کرو۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بستی میں!"

"کیا منی سے ملنے؟"

"ہاں!"

"اس کے پاس نہ جاؤ ایبن! وہ اچھی عورت نہیں ہے۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ ہم فطری تقاضوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں اقرار کرنے جا رہا ہوں۔"

"نہیں ایبن! وہ تمہارے پیار کے قابل نہیں ہے۔"

"ہے۔ وہ تم سے اچھی ہے۔ وہ تمہاری طرح میری ماں کی جائیداد پر قبضہ جمانے کے لیے یہاں نہیں آتی۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تم ایک بازاری عورت سے میرا موازنہ کر رہے ہو۔"

"بازاری تم ہو' جس نے زمین' جائیداد کے لالچ میں ایک بوڑھے کے ہاتھوں اپنی

جوانی بیچ دی۔"

"یو شٹ اپ!" وہ چیخ کر بولی۔ "تم کمینے پن کی باتیں کر رہے ہو۔ میں تمہاری جتنی عزت کرتی ہوں' تم اتنی ہی میری توہین کرتے ہو۔ میں اگر چاہوں تو تمہارے پاپا تمہیں چابک سے مار مار کر یہاں سے بھگا دیں گے۔ میرے سامنے تمہاری کیا اوقات ہے۔ تم میری مہربانیوں سے یہاں زندگی گزار رہے ہو۔ جس دن میں تمہاری دشمن بن گئی' وہ اس گھر میں تمہارا آخری دن ہو گا۔ جاؤ' دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی.........."

"مجھے بھی تمہاری صورت سے نفرت ہے.......... نفرت ہے۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ایبی غصے سے ہونٹ چباتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ سڑک کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ایبی کا غصہ پچھتاوے میں بدل گیا۔ وہ ویران سڑک کی جانب یوں دیکھنے لگی جیسے خاموش نگاہوں سے جانے والے کو پکار رہی ہو۔

کیبوٹ کھلیان کی طرف سے آ رہا تھا۔ اس نے قریب آتے ہی گیٹ کے اس پار سڑک کو دیکھا اور ایبی سے پوچھا۔ "کیا تم دونوں پھر جھگڑا کر رہے تھے؟"

"نہیں!" اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"نہیں کیا؟ میں نے تم لوگوں کو جھگڑتے سن لیا ہے۔"

اس نے چونک کر کیبوٹ کو دیکھا' پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "جب تم نے سن لیا ہے تو پھر کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟"

اس نے کھلیان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اتنی دور سے کیا باتیں سمجھ میں آتی ہیں؟ میں نے تو صرف تم دونوں کے بھونکنے کی آواز سنی تھی۔"

وہ ناگواری سے گیٹ کی جانب دیکھنے لگی۔ کیبوٹ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایبن دل کا برا نہیں ہے۔ ہاں' وہ تم سے محض اس لیے جھگڑا کرتا ہے کہ تم اس کی ماں کی جگہ آ گئی ہو۔ وہ اول درجے کا احمق ہے۔ اسے اتنا تو سمجھنا چاہیے کہ یہ زمینیں اس کی ماں کی ہوں یا باپ کی' میرے بعد وہی انہیں سنبھالے گا۔"

ایبی نے چونک کر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جو لڑکا ابھی اس سے نفرت کرتا ہے' وہ یہاں کا مالک بن کر اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ ظاہر

ہے کہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے گا۔

وہ دل ہی دل میں بولی۔ ”ابھی تو وہ آہستہ آہستہ چوری چوری میری طرف مائل ہو رہا ہے‘ جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ بوڑھے کے مرنے کے بعد میری کوئی اہمیت نہیں رہے گی تو وہ اور زیادہ مغرور ہو جائے گا‘ مجھ سے اور زیادہ نفرت کرے گا۔ نہیں‘ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیبوٹ کے فیصلے کو بدلنا ہی ہو گا.........“

وہ ذرا تیز لہجے میں بولی۔ ”تمہارے بعد وہ یہاں کا مالک ہو گا‘ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ میرا انجام کیا ہو گا؟“

”ابی! میں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ یہاں کی زمینیں سنبھالے گا‘ یہ تو نہیں کہا کہ مالک بن جائے گا۔ تم عورت ہو‘ زمینوں کا کام نہیں کر سکتی۔“

”کچھ بھی ہو‘ تمام اختیارات اسی کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ وہ اپنی من مانی کرے گا۔ یہاں کی ساری کمائی مِنی پر لٹائے گا۔“

”مِنی؟“ وہ تعجب سے بولا۔ پھر ہنسنے لگا۔ ”جوانی میں سبھی نادانی کرتے ہیں اور ایبن شروع سے ہی نادان ہے۔“

ابی نے اپنی بات کو بے اثر ہوتے دیکھ کر دوسری چال چلی۔ ”وہ نادان نہیں‘ بہت چالاک ہے۔ وہ تمہارے سامنے محض دکھاوے کے لیے مجھ سے جھگڑا کرتا ہے مگر مجھے تنہا دیکھتے ہی اس کی نیت بدل جاتی ہے۔ ابھی میں اسی بات پر اس سے جھگڑا کر رہی تھی۔

کیبوٹ کے تیور بدل گئے۔ اس نے پوچھا۔ ”کس بات پر؟“

”وہ......... وہ کہہ رہا تھا کہ......... کہ پاپا بوڑھے ہو گئے ہیں اور وہ جوان ہے۔ پاپا سے زیادہ.........“

”میں اسے گولی مار دوں گا۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کہاں ہے میری بندوق‘ نہیں......... میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ اسے بتا دوں گا کہ ان ہاتھوں میں کتنی قوت ہے۔ اتنی قوت ہے کہ میں اسے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دوں گا۔“

وہ گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ابی جلدی سے دوڑ کر اس کے سامنے آ گئی۔

”ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میں اسے مار ڈالوں گا یا پھر گھر سے دھکے دے کر نکال دوں گا۔ مجھے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ بوڑھے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بولی۔ ”تم میری پوری بات تو سنو۔ اس نے

یہ بات مذاق سے کی تھی میں نے اسے جواب دیا کہ تمہارے پاپا بوڑھے ہیں مگر میرے لیے جوان ہیں۔ اس نے مذاق میں کہا تھا‘ میں نے سنجیدگی سے ڈانٹ دیا۔ اب وہ کبھی ایسی بات نہیں کہے گا۔“

”مگر اس نے میرے بڑھاپے کا مذاق کیوں اڑایا؟“

”وہ احمق ہے......... مگر تم اسے یہاں سے بھگا کر حماقت نہ کرو۔ وہ چلا جائے گا تو پھر تمہارے ساتھ کھیتوں پر کون کام کرے گا۔ کسی دوسرے کو رکھو گے تو وہ کھانا‘ کپڑا اور نقدی‘ سب کچھ مانگے گا۔ اگر بے ایمان نکلا تو چوری کرے گا‘ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ ایبن کیسا بھی ہو‘ گھر کا لڑکا ہے۔ اس پر سختی نہ کرو۔“

وہ نرم پڑ گیا۔ ابی نے معقول بات کہی تھی اسے کھیتوں پر کام کرنے کے لیے ایک آدمی کی ضرورت تھی اور وہ ضرورت اس کے بیٹے سے پوری ہو رہی تھی۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں پورچ کے برآمدے میں بیٹھ گیا اور مایوسی سے بولا۔

”سائمن اور پیٹر میرا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ ایبن سے بھی مجھے کوئی توقع نہیں ہے۔ میں اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی یہ جائیداد کسی کے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ میں مرنے سے پہلے انہیں آگ لگا دوں گا اور بستر مرگ پر سکون سے لیٹ کر گھر جلنے کا تماشا دیکھوں گا۔ میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ جلتا رہے گا۔ یہ گھر‘ یہ درخت‘ اناج کا ایک ایک دانہ‘ گھاس کا ایک ایک تنکا‘ سب کے سب میرے ساتھ اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ ہاں......... صرف بے زبان مویشیوں کو آزاد کر دوں گا۔“

”اور میرا کیا ہو گا؟“ ابی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم بھی آزاد ہو جاؤ گی۔“

”شکریہ!“ وہ تلخی سے بولی۔ ”کیا تم نے اسی لیے مجھ سے شادی کی ہے کہ اپنے بعد مجھے بے آسرا چھوڑ دو؟ میں تمہاری بیوی ہوں۔ قانوناً تمہاری جائیداد کی حق دار ہوں۔“

وہ بدستور مایوسی سے بولا۔ ”ہاں حقدار ہو۔ تمہیں کچھ مل جائے گا‘ باقی سب جل کر راکھ ہو جائے گا۔ جو حقدار تھے‘ جو میرے نام لیوا تھے‘ ان سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔“

ابی نے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر زیر لب مسکرا کر بولی۔ ”ایک حقدار آ سکتا ہے۔ تمہارا ایک نام لیوا ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارا ایک بیٹا پیدا ہو جائے۔“

وہ حیرت سے اچھل کر اس کی طرف پلٹ گیا۔

"تت......... تمہارا مطلب ہے میرا......... میرا اور تمہارا بیٹا؟"

وہ شوخی سے بولی۔ "ہاں۔ کیوں میں تمہارے بچے کی ماں نہیں بن سکتی؟ تم زیادہ بوڑھے تو نہیں ہو۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں' تم بھی جانتے ہو۔ پھر ہمارے ہاں بیٹا کیوں نہیں ہو گا؟"

کیبوٹ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ آدمی خواہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو' وہ ایسے وقت ضرور خوش ہوتا ہے' جب عورت اس کی مردانگی کی تعریف کرتی ہے۔ اس نے خوشی سے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جوان بیوی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"ایبی......... تم......... کیا تم میرے بچے کی ماں بننے کی تمنا کر رہی ہو؟ کیا تم دل سے چاہتی ہو کہ ہمارا ایک بیٹا ہو؟"

"ہاں۔ میں دن رات ایک بیٹے کے لیے دعا مانگتی ہوں۔"

وہ جوشیلے انداز میں اس کا بازو تھام کر بولا۔ "تو پھر آؤ' میں بھی دعا مانگتا ہوں۔ ایک دعا کی نسبت دو دعائیں زیادہ پُراثر ہوتی ہیں۔ آؤ گھٹنے ٹیک دو۔ خدا کا بیٹا سن رہا ہے۔ ہمیں ایک بیٹا ضرور ملے گا۔"

وہ برآمدے میں گھٹنے ٹیک کر دعا کے لیے نیم استادہ ہو گیا......... پچھتر برس کی عمر میں مرد ہمیشہ دعا کا سہارا لیتا ہے۔

ایبی اس کے برابر نیم استادہ ہو کر بولی۔ "اگر بیٹا ہو گیا تو تم یہ زمین' یہ مکان اور یہ ساری جائیداد میرے اور میرے بیٹے کے نام لکھ دو گے۔"

"میں سب کچھ تمہارے نام لکھ دوں گا۔ تم جو کہو گی' وہ کروں گا......... او خدایا۔ میں ایک بیٹے کا باپ بن سکتا ہوں۔ اپنے نافرمان بیٹوں کو بتا سکتا ہوں کہ میں بوڑھا اور کمزور نہیں ہوں......... دعا مانگو ایبی......... سر جھکا کر دعا مانگو۔ میں سر اٹھا کر دنیا کے سامنے چلوں گا........."

یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور اپنی آنکھیں بند کر کے دعائیہ فقرے ادا کرنے لگا۔ ایبی نے سر کو جھکا لیا تھا مگر وہ کن انکھیوں سے مسکرا کر اس بوڑھے کو دیکھ رہی تھی۔

☆======☆======☆

بیڈ روم میں موم شمع کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایبن بستر کے سرے پر سر جھکائے اپنی ایک مٹھی پر ٹھوڑی ٹیکے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں کے سامنے

ایبی بار بار آ کر انگڑائی لے رہی تھی۔ کلی کی طرح چٹک رہی تھی' پھول کی طرح کھل کر مسکرا رہی تھی اور دل کی دھڑکنوں میں دھماکے کی طرح بج رہی تھی۔

جب سے وہ اس مکان میں آئی تھی' تب سے وہ اس کے خیال سے پیچھا چھڑا رہا تھا۔ اس نے نفرت کی۔ اس نے دشمن کی نظروں سے دیکھا۔ اس نے حقیقت کو جھٹلایا کہ وہ حسین نہیں ہے' جوان نہیں ہے۔ اس نے بچاؤ کی کتنی ہی نفرت انگیز تدبیریں کیں لیکن وہ ناگن ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کی سوچ میں آ کر اسے ڈس رہی تھی اور زہر کی طرح دماغ کی رگ رگ میں پھیلتی جا رہی تھی۔

وہ بستر سے اتر کر بڑے اضطراب سے ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے کے دوران اس کے قدم دھماکے سے فرش پر پڑ رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کے منہ زور جذبوں کو قدم قدم پر کچل رہا ہے۔

پھر وہ ذرا دیر کے لیے رک گیا اور سامنے دیوار کو ایک عجیب لگن سے تکنے لگا۔ دیوار کی دوسری طرف ایبی اور کیبوٹ کی خوابگاہ تھی۔ وہ دونوں پلنگ کے سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیبوٹ کی آنکھوں میں پھر سے باپ بننے کی تمنا جاگ رہی تھی اور ایبی کی آنکھیں بڑی لگن سے اسی دیوار کو تک رہی تھیں' جس کے دوسری طرف ایبن کی خوابگاہ تھی۔ دونوں اس دیوار کو ایسے تک رہے تھے جیسے اس کے آر پار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔

کیبوٹ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر حسرت سے کہا۔ "میری زمینوں کو ایک بیٹے کی ضرورت ہے۔"

"اور میرے ہونے والے بیٹے کو تمہاری زمینوں کی ضرورت ہے۔" ایبی نے کہا۔

"مرد ایک کسان ہے' عورت ایک زمین ہے اور اولاد ایک میٹھی فصل۔ ہمارے ہاں بیٹا ضرور ہو گا۔"

ایبی نے دیوار کو تکتے ہوئے کہا۔ "ہاں ضرور ہو گا۔"

وہ اپنی حساس سماعت سے ایبن کے قدموں کی دھمک سن رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ بے چین ہے اور دہکتے ہوئے جذبات کے انگاروں پر ٹہل رہا ہے۔

وہ کبھی ٹہل رہا تھا اور کبھی رک کر دیوار کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اسے یوں لگا جیسے ایبی دیوار کے پار سے بانہیں پھیلائے اس کی طرف آ رہی ہے۔ اس نے بھی بے

اختیار اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے' پھر فوراً ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ دیوار سے منہ پھیر کر بستر کے قریب آیا اور اوندھے منہ تکیے پر گر پڑا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ وہ بار بار تکیے پر اپنا سر پٹخ رہا تھا۔ اپنی شکست پر جھنجلا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی رونے لگا۔ بالکل بچوں کی طرح وہ بچہ ہی تھا.......... ایسا بچہ' جسے صرف اپنی ماں سے محبت تھی اور جس کی زندگی کا مقصد اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی حفاظت کرنا تھا لیکن وہ دشمن عورت اسے جذبات کی آندھی میں تنکے کی طرح اڑائے لے جا رہی تھی۔

کیبوٹ نے ایبی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم بہت خاموش ہو.......... کیا بات ہے؟"

"آں!" وہ چونک گئی۔ دیوار سے نظریں ہٹا کر اس نے کیبوٹ کو دیکھا' پھر بیزاری سے بولی۔ "میں تھک گئی ہوں۔"

"ہوہوہو!" وہ بے ڈھنگے پن سے ہنستے ہوئے بولا۔ "ہاں ہاں تھکن تو ہوتی ہی ہے۔ اسی لیے میں ساری رات یہاں نہیں گزارتا' مویشیوں کے باڑے میں جا کر سو جاتا ہوں۔ ایک کسان کو عورت کی بھی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور مویشیوں کی بھی۔ تم تھک گئی ہو تو سو جاؤ' مجھے تو وہاں چوکیداری کے لیے جا کر کبھی سونا ہو گا' کبھی جاگنا ہو گا۔"

وہ قمیض اٹھا کر پہننے لگا۔

ایبی چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنے اوپری نصف چہرے کو دائیں بازو سے چھپا لیا اور گداز بازو کے پیچھے سے کیبوٹ کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ کمرے سے باہر چلا گیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پوری توجہ سے اس کے قدموں کی چاپ سننے لگی۔ رات کے سناٹے میں کیبوٹ کے سیڑھیاں اترنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر وہ بستر سے اٹھ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ زینے پر کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر سے دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔

ایبی نے زینے کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ تاکہ کیبوٹ واپس آنا بھی چاہے تو دستک دیئے بغیر نہ آ سکے۔

ایبن بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی زینے پر بھاری قدموں کی چاپ سنی تھی اور یہ سمجھ گیا تھا کہ بوڑھا اپنے دستور کے مطابق مویشیوں کے باڑے میں سونے چلا گیا ہے۔ رات.......... تنہائی.......... پاس والے کمرے میں جوان عورت.......... کوئی روکنے

والا نہیں تھا' کوئی ٹوکنے والا نہیں تھا۔ راستہ صاف اور سیدھا تھا.......... اس کے قدم بے اختیار اپنی خوابگاہ سے باہر جانے لگے۔

اسی وقت ایبی دروازہ کھول کر سامنے آ گئی۔ وہ ٹھٹک گیا.......... شب خوابی کے لباس میں اس کا بدن شعلے کی طرح آنچ دے رہا تھا۔ وہ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم.......... تم میرے پاس آ رہے تھے؟"

"نن.......... نہیں! میں.......... میں تم سے نفرت.........." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

ایبی زیرِ لب مسکراتی ہوئی الٹے قدموں واپس جانے لگی۔

"میں جا رہی ہوں۔ تم میرے پاس آؤ گے.......... میں نیچے جا کر باہر کا دروازہ بند کر دوں گی اور.......... اور ڈرائنگ روم میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس کی نظریں ایبن کی نظروں میں پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ایبن اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کی کمزوری عیاں تھی۔ وہ نظریں جھکا سکتا تھا نہ چرا سکتا تھا۔ پھر وہ خود ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆======☆======☆

پرانے طرز کا ڈرائنگ روم نہایت ہی تنگ و تاریک تھا۔ وہاں قدم رکھتے وقت ایبی کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قبر کی تاریکی میں اتر آئی ہو۔ اس نے تاریکی اور گھٹن سے بچنے کے لیے تمام شمعیں روشن کر دیں اور ایپال اسپ کے صوفے پر ایک کنارے سمٹ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ پریشان اور خوفزدہ ہے اور اچانک ہی وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ پتہ نہیں' پریشانی کس بات کی تھی۔ اس ماحول کی گھٹن کی وجہ سے یا اپنے دل میں اٹھنے والے طوفان کی وجہ سے..........

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کی چوکھٹ پر ایبن سحر زدہ سا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے الجھن ظاہر ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی آسیبی خواب کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہوا وہاں تک آ گیا ہے۔ اس کی نظریں ایبی پر مرکوز تھیں۔ اس کے دونوں بازو بے حس و حرکت اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے شانوں سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔

ایبی نے لرزتی ہوئی آواز میں رسمی تکلف سے کہا۔ "آؤ.......... بیٹھو!"

وہ ایک معمول کی طرح اپنے عامل کے اشارے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے لیکن پتھر کے مجسموں کی طرح اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ ایک انجانا سا خوف ان کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔

ایبی نے اِدھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں یہاں آئی تو اندھیرے میں مجھے ایک سایہ نظر آیا تھا۔"

"وہ میری ماں ہو گی۔" ایبن نے جلدی سے کہا۔

"نہیں کچھ اور ہی تھا......... تھا نہیں' ہے۔ میں ابھی اپنے آس پاس اسے محسوس کر رہی ہوں۔"

"پھر تو وہ یقیناً میری ماں ہے۔"

"اف!" وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "پہلے تو میں گھبرا گئی تھی۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن تم آ گئے۔ خدا کا شکر ہے' تمہارے آتے ہی یہ ماحول خوشگوار ہو گیا ہے۔"

وہ اپنی ہی دھن میں بولا۔ "میری ماں ہمیشہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔"

"میں بھی تم سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ محبت کئی طرح کی ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہو گی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس وقت ماں تم سے نفرت کر رہی ہو گی۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہاری ماں بہت اچھی عورت ہے اور ایک اچھی عورت مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی........."

"نہیں۔ تم نے میری ماں کی جگہ چھین لی ہے۔ تم نے........."

وہ کہتے کہتے رک گیا اور اپنی ماں کی تعریف کرنے والی ایبی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ "ہاں۔ میری ماں بہت اچھی تھی۔ ابھی......... ابھی وہ میرے دل میں بیٹھی کہہ رہی ہے۔ کہ میں تم سے نفرت .... نفرت نہ کروں۔"

وہ خوش ہو کر ذرا اور قریب چلی آئی۔

"ہاں......... میں نے جان بوجھ کر اس کی جگہ نہیں لی ہے۔ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"لیکن اسے پاپا سے شکایت تھی۔"

"تمہارے پاپا سے ہم بھی خوش نہیں ہیں۔ تم ان کی باتیں جانے دو' ماں کی باتیں کرو۔"

وہ سمجھتی تھی کہ ایبن بیک وقت جوان بھی ہے اور بچہ بھی۔ اگر اس کے مزاج کے مطابق باتیں نہ کی گئیں تو وہ بدک جائے گا۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکتی ہوئی بولی۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری ماں مجھ سے بے حد خوش ہے' کیونکہ میں تم سے محبت کر رہی ہوں اور تمہاری ماں کا احترام کر رہی ہوں۔ تم اس کی باتیں کرو۔ اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ وہ آج ہم دونوں پر مہربان ہے۔"

"ماں......... میری ماں......... وہ بہت مہربان تھی۔ اس کی مثال کبھی نہیں ملتی۔"

"میں بھی تم پر مہربان ہوں اور تمہارے لیے اپنی محبت کو بے مثال بنا دوں گی۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ ایبن کو احساس نہ ہو سکا کہ وہ ایک جذباتی قربت ہے۔ اس نے اپنے سامنے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"جب مجھے نیند آتی تھی' وہ مجھے لوریاں سناتی تھی۔"

"میں بھی تمہیں لوریاں........." اس کی زبان لڑکھڑا گئی' پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"نن......... نہیں......... عمر کے ساتھ رویوں کا انداز بدل جاتا ہے' میں تمہیں گیت سنایا کروں گی۔"

"آہ......... یہ گھر......... یہ زمینیں سب اس کی تھیں۔ پاپا نے اس سے یہ سب کچھ چھین لینے کے لیے شادی کی تھی۔ پاپا کی محبت میں خودغرضی تھی۔"

"اس نے اپنے ظلم و ستم سے میری ماں کو ہلاک کیا ہے۔"

"ہاں۔ وہ مجھے بھی آہستہ آہستہ قتل کر رہا ہے۔"

"آہ......... وہ مر گئی.........وہ' جو مجھے لوریاں سناتی تھی اور مجھ پر اپنی ممتا کی تمام دولت نچھاور کرتی تھی......... وہ مر گئی......... مر گئی........."

وہ رونے لگا۔ ہچکیاں لے لے کر کہنے لگا۔

"میں اسے کہاں تلاش کروں۔ وہ گمشدہ محبت مجھے کہاں ملے گی......... ماں......... ماں........."

ایبی نے تڑپ کر دونوں بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں اور اس سے لپٹ

کر جذباتی انداز میں بولی۔ ”میرے ایبن! آنسو پونچھ لو.......... میرے پیارے ایبن! میں تمہیں گیت سناؤں گی۔ تم سے محبت کروں گی۔ تمہارے لیے مر جاؤں گی۔ میری جان۔ میرے ایبن..........“

ابی کے اندر کی عورت ایک لمحے کے لیے بدل گئی۔

اس ایک لمحے میں اس کے لہجے اور اس کے ہر انداز سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جانے والی ممتا کا اظہار ہونے لگا۔

”اے بن! چپ ہو جاؤ۔ تمہاری سسکیاں میرے کلیجے میں چبھ رہی ہیں۔ چپ ہو جاؤ میری جان' چپ ہو جاؤ..........“

اس ایک لمحے کا مزاج ذرا بدل گیا۔

وہ ایک ماں کی طرح سمجھانے لگی اور ایک عورت کی طرح اس سے لپٹ لپٹ کر اپنے بدن کو سینکنے لگی۔

بعض اوقات جذبات کی افراتفری میں ایسی دوغلی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دل کدھر جا رہا ہے اور دماغ کدھر جا رہا ہے۔ ممتا کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں اور عزت کے پاؤں کہاں پھسل رہے ہیں۔

وہ ایبن کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی سانسوں کے قریب لے آئی۔

ایبن نے بڑی کمزور سی مزاحمت کی۔

”میرے ایبن! میں تم سے محبت کر رہی ہوں۔ مجھے پیار کرو۔ ایسا پاکیزہ بوسہ' جو غلیظ نہیں ہوتا.......... جو آئینے کی طرح شفاف ہوتا ہے.......... جو دودھ کی طرح اجلا اور میٹھا ہوتا ہے۔ میرے ہونٹوں کو اس طرح چھولو کہ دوستی کہ ابتداء اور محبت کی انتہا ہو جائے..........“

ایبن اس پر جھک گیا۔

دونوں کے ہونٹ بڑی آہستگی سے اور بڑی نرمی سے اس طرح ملے جیسے مصافحے کے لیے دو ہاتھ خلوص سے ملتے ہیں۔

اس بوسہ کی ابتدائی پاکیزگی میں شبہہ نہیں تھا لیکن پھر اس پاکیزگی اور خلوص میں سانسوں کی گرمی گھلنے لگی۔

شفاف آئینے میں ذرا سا بال آ گیا۔

دودھ میں ذرا سا پانی مل گیا وہ بوسہ ایک ضدی بچے کی طرح مچلنے لگا۔

وہ بوسہ انسانی تاریخ کی ابتداء سے' شجر ممنوعہ کے سائے سے رینگتا رینگتا ان کے لبوں تک آیا تھا اس لیے منہ زور جذبات کی طرح لب بہ لب پھڑپھڑانے لگا۔

وہ شجر ممنوعہ کی چھاؤں میں تھے.......... وہ شجر ممنوعہ' جس کی جڑیں جنت آسمانی میں ہیں اور جس کا سایہ جنت ارضی پر پھیلتا ہے اور جس کے سائے میں بنت حوا اور ابن آدم آج بھی جلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس جلن کا اظہار نہیں کرتے۔ اخلاق اور تہذیب کی پابندیوں میں چور جذبوں کو چھپائے پھرتے ہیں.......... ایبن نے دیوانہ وار ان جذبوں کو چومتے ہوئے کہا۔

”اب میں سمجھا کہ میرے دل میں چور تھا۔ اسی دن سے' جس دن تم یہاں آئی تھیں۔

میں اپنی محبت کو چھپانے کے لیے تم سے نفرت کرتا رہا۔

تمہیں غاصب کہتا رہا' حالانکہ میرا باپ غاصب ہے' جس نے میری ماں سے سب کچھ چھین لیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنی ماں کا انتقام لے رہا ہوں۔ میں بھی پاپا سے سب کچھ چھین رہا ہوں۔ تمہیں چھین کر..........“

یکبارگی وہ ابی پر چھا گیا اور اسے ایک وحشی کی طرح جھنجھوڑنے لگا۔

☆======☆======☆

صبح ہو رہی تھی۔

ایبن کھیتوں پر جانے کے لیے مکان سے باہر آیا تو پچھلی رات کے نشے میں اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے چہرے' آنکھوں اور اس کی مسکراہٹوں سے ایک مرد کا اعتماد اور پختگی جھلک رہی تھی۔

کھلی فضا میں آ کر اس کا سارا جسم مستی اور مسرتوں کی فراوانی سے ٹوٹنے لگا۔ اس کا دماغ ہوا بھرے ہوئے غبارے کی طرح بلندی کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ چلتے وقت اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ اب بھی ابی کے سینے میں خراماں خراماں سانسوں کی طرح اتر رہا تھا۔

اسی وقت ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھل گئی اور جھری دار چلمن اوپر کو اٹھنے لگی۔

کھڑکی کے فریم میں ابی ایک تصویر کی طرح مسکرا رہی تھی۔ اس کی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں' چہرہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں نیند کے بوجھ سے نیم وا تھیں۔ اس نے ابین کو دیکھ کر بڑی محبت سے پکارا۔

"ابین!"

اس نے پلٹ کر دیکھا' پھر مسکراتے ہوئے قریب آنے لگا۔

"تم جا رہے ہو۔ میں صبح سے شام کیسے کروں گی......... آؤ' پھر ایک بار مجھ سے پیار کرو۔ تمہارے پیار نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔"

"تم نے بھی مجھے پاگل بنا دیا ہے........" وہ قریب آ گیا۔

ابی کھڑکی سے باہر جھک گئی اور اپنی دونوں بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں۔

صبح کی تازہ اور خنک ہوا ان کے چہروں کو چھو رہی تھی اور ان کی سانسوں اور ان کے ہونٹوں کو چوم رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کی سانسوں میں الجھے رہے' پھر ابین نے کہا۔

"بس......... اتنا کافی ہے' آئندہ کے لیے بھی کچھ بچا کر رکھو۔"

"میں نے تمہارے لیے بہت کچھ بچا رکھا ہے' کبھی تمہیں کمی کا احساس نہیں ہونے دوں گی۔ تم ایک بار مجھ سے کہو کہ مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"میں کسی بھی دوشیزہ کے مقابلے میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔"

وہ میٹھی ناراضگی سے بولی۔ "صرف پسند کرتے ہو......... محبت نہیں کرتے؟"

"محبت کرتا ہوں۔ محبت کرتا ہوں۔ اب تو یقین آ گیا نا؟"

"اوہ ڈیر۔ تم بہت اچھے ہو۔"

ابین نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے مویشیوں کے باڑے میں جانا چاہیے۔ وہ بوڑھا آ گیا تو شبہ کرے گا۔"

وہ بڑے اعتماد سے ہنستی ہوئی بولی۔ "اسے آنے دو۔ میں اپنے پیار کو ہمیشہ اس کی نظروں سے چھپا کر رکھوں گی اور یہ دریچہ بھی ہمیشہ کھلا رہے گا تاکہ کمرے میں دھوپ اور ہوا آتی رہے۔ اس کمرے نے مجھے ایک نئی محبت عطا کی ہے۔ اب یہ صرف میرا کمرہ ہے۔"

وہ میٹھی ناراضگی سے بولا۔ "صرف تمہارا؟"

"نہیں۔ ہم دونوں کا ہے۔"

"ہاں!"

"یہ کمرہ ہم دونوں کا رازدار ہے۔"

وہ کسی قدر اداسی سے بولا۔ "کبھی یہ کمرہ صرف میری ماں کا تھا۔ اب وہ قبر میں سو رہی ہے۔ شاید وہ سکون سے ہو گی!"

"خدا اسے سکون نصیب کرے۔ دیکھو ابین! یہ ہماری نئی زندگی کی پہلی صبح ہے۔ تمہیں اداس کرنے والی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"سوری ابی! یہ بات آپ ہی آپ دماغ میں آ گئی تھی۔"

وہ جماہی لیتی ہوئی بولی۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں جا کر سو جاؤں گی' اس بوڑھے سے بہانہ کروں گی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آہا......... وہ دیکھو......... وہ باڑے کی طرف آ رہا ہے۔ تم اپنا حلیہ درست کرو اور بیڈ روم میں چلی جاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔ کھیتوں میں کام کرتے وقت مجھے یاد کرتے رہنا۔ میں بھی تمہیں خواب میں دیکھتی رہوں گی۔ خدا حافظ........."

وہ ایک ہوائی بوسہ لہرا کر چلی گئی۔ ابین مسکرا کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ دوسری طرف پلٹ گیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بڑے اعتماد اور دیدہ دلیری سے کیبوٹ کا انتظار کرنے لگا۔

کیبوٹ مکان کے بائیں طرف سے آ رہا تھا اور چلتے چلتے آسمان کی جانب سر اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ ابین نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

"پاپا! بڑھاپے نے تمہاری بینائی کمزور کر دی ہے۔ تم مکان کے اس کونے سے اس کھڑکی تک نہیں دیکھ سکتے' پھر آسمان کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "برخوردار! جوانی' آنکھوں سے دیکھتی ہے اور بڑھاپا' دماغ سے۔ میں آج بھی اڑتی چڑیا کے پر گن سکتا ہوں۔"

ابین نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہو ہو ہو۔ اس دنیا کا ہر بوڑھا خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے۔ بے چارے پاپا! چڑیا کے پر گن رہے ہیں۔ بڑھاپے

میں چڑیمار بن رہے ہیں۔ ہوہوہاہاہا.........''

وہ اپنے کولہوں پر دونوں ہاتھ مار مار کر ہنسنے لگا۔ بوڑھے نے اپنی بھنویں سکیڑ کر غراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم نشے میں ہو؟ معلوم ہوتا ہے تم نے میری بوتل سے چرا کر پی ہے۔''

''تمہاری بوتل......... ہاہاہاہا......... ہاں' وہ تمہاری ہی بوتل ہے' جس سے میں نے ایسی شراب پی ہے کہ نشہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہاہاہاہا۔ ہوہوہوہو.........''

کیبوٹ نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ ''ایبن! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

ایبن کے قہقہے رک گئے۔ وہ سر تھام کر سوچنے لگا کہ وہ اپنے باپ کا مذاق کیوں اڑا رہا ہے؟ جب اس کی سمجھ میں آ گیا تو اس نے کہا۔

''پاپا! کبھی تم یہ سوچتے ہو کہ وہ عورت کتنی بے چین رہتی ہو گی۔''

کیبوٹ نے شبہے کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کس عورت کی بات کر رہے ہو؟''

''میری ماں......... میری ماں قبر میں بے چین رہتی ہو گی۔ تم نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہے......... نہیں نہیں......... جیسے کو تیسا......... اب وہ قبر میں سکون سے سو رہی ہو گی۔''

''ہاں۔ وہ پُرسکون ہے۔ میں بھی تمام رات مویشیوں کے باڑے میں سکون سے سوتا رہا۔''

ایبن کی زبان پھر زہریلی ہو گئی۔

''پھر تو مویشیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیا تم کھیتوں پر نہیں جاؤ گے؟''

کیبوٹ نے غصے سے پوچھا۔ ''میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ تم سے مطلب؟ کیا تم مجھ پر حکم چلا رہے ہو؟ کیا تم میرے آقا ہو؟''

''آقا......... ہاہاہا......... اگر میں آقا بن جاؤں تو تمہارے دل پر کیا گزرے گی۔ نہیں نہیں......... فی الحال میں آقا نہیں بننا چاہتا۔ مجھے غلامی ہی میں جنت مل رہی ہے......... گڈ بائی پاپا!''

وہ ہنستے ہوئے اور مستی میں جھومتے ہوئے کھیتوں کی طرف جانے لگا۔

بوڑھے کیبوٹ نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''احمق۔ بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔ پیدائشی احمق ہے۔ اونہہ.........''

وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر آگے بڑھ گیا اور مکان کے اندر جانے لگا۔

☆======☆======☆

ایک سال گزر گیا۔

ایبن اپنے بستر کے سرے پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک موی شمع کی زرد اور اداس روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اداسی محض اسی کمرے تک محدود تھی' ورنہ نچلی منزل کے باورچی خانے میں کچن پارٹی کا جشن برپا تھا۔ شراب کے پیالے گردش میں تھے' سازینے بج رہے تھے اور عورتوں کی سریلی ہنسی اور مردوں کے قہقہے گڈمڈ ہو کر ایبن کے کانوں تک پہنچ رہے تھے اور دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔

اس نے جھنجھلا کر فرش پر اتنی زور سے پاؤں مارا جیسے وہ نچلی منزل سے ابھرنے والے شور کو کچل دینا چاہتا ہو۔ پھر وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قدر بے چین کیوں ہے اور وہ خوشیاں اسے زہر کیوں لگ رہی ہیں۔

اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر سامنے دیوار کی جانب دیکھا۔ دیوار کے اس پار ایبی اور کیبوٹ کی مشترکہ خوابگاہ کا بستر خالی تھا لیکن بستر کے قریب لکڑی کے ایک پالنے میں ایک ننھا سا بچہ سو رہا تھا۔

کیبوٹ دیسی شراب کے مٹکے سے جام بھر بھر کر مہمانوں کو پلا رہا تھا۔ خود بھی پی رہا تھا اور مستی میں جھوم جھوم کر قہقہے لگا رہا تھا۔

مہمان اسے خوشی سے اتراتے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے دوسرے بوڑھے کو آنکھ مار کر معنی خیز انداز میں کیبوٹ کی جانب اشارہ کیا۔ ایک نوجوان لڑکی نے اپنے محبوب کے کان میں کوئی بات کہی اور منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ دوسری عورتیں بھی اسی طرح سرگوشیاں کر رہی تھیں اور موقع محل کے اعتبار سے ایک دوسرے کو لطیفے سنا رہی تھیں۔

مہمانوں کی اس بھیڑ میں ایبی تنہا تنہا سی تھی۔ وہ رسمی طور پر وہاں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی اس کی بے چین نظریں بار بار دروازے کی جانب یوں اٹھ جاتی تھیں جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔

جب انتظار کی حد ہو گئی اور اضطراب بڑھنے لگا تو اس نے دائیں طرف بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا۔ "ایبن کہاں ہے؟"

لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ "میں کیا جانوں۔ ایک مدت ہو گئی میں نے اسے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم نے اسے قید کر رکھا ہے۔"

لڑکی یہی بات دہرانے کے لیے اپنی ماں کی طرف پلٹ گئی۔ ایبی کے بائیں طرف ایک صحت مند ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں نشے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایبی کو دیکھا تو وہ بولی۔

"تم نے ایبن کو دیکھا ہے؟"

اس نے مسکرا کر اس کی جانب جھکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس کے لیے بہت بے چین ہو؟"

"آں .... نن......... نہیں......... میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ وہ ناچ گانے کا شوقین ہے' اسے اس محفل میں شریک ہونا چاہیے۔"

"یہاں سب ہی ناچ گانے کے شوقین ہیں۔ ایک بات کہوں ایبی!" وہ رازدارانہ سرگوشی میں بولا۔ "جب ایبن سے دل بھر جائے تو مجھے ضرور یاد کرنا۔ میں کیبوٹ کی طرح بوڑھا نہیں ہوں۔ دیکھو' میری بات کا برا نہ ماننا' میں نے بہت زیادہ پی لی ہے' نہ جانے کیا بک رہا ہوں۔"

ایبی نے اسے ناگواری سے دیکھا اور دوسری طرف منہ کر کے بڑبڑانے لگی۔

"نہ جانے وہ کیا کر رہا ہے' ابھی تک نہیں آیا........."

اس کی بڑبڑاہٹ ایک زبان سے دوسری زبان تک رینگتی چلی گئی۔ ذرا دور ایک وائلن نواز اپنے وائلن کے تار درست کر رہا تھا' اس نے کہا۔

"ایبی! میں جانتا ہوں کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ خدا کا شکر ادا کرنے چرچ کی طرف گیا ہے۔"

اس کی بات سنتے ہی سب دانت نکال کر مسکرانے لگے۔ ایک شخص نے پوچھا۔

"بھئی کس بات کا شکریہ ادا کرنے گیا ہے؟"

وائلن نواز نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ اس کا۔ بے......... بھائی پیدا ہوا ہے۔"

اس بات پر قہقہوں کا ایک طوفان اٹھ گیا۔ سب کے سب کبھی ایبی اور کبھی کیبوٹ

کو دیکھنے لگے۔

ایبی کو ان کے طنز اور قہقہوں کی قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ اب بھی اسی بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

دور کھڑے ہوئے کیبوٹ نے ان کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ اس لیے وہ قہقہے اسے بے تکے معلوم ہوئے' اس نے آگے بڑھ کر ناگواری سے کہا۔ "تم لوگ بے سرے قہقہے کیوں لگا رہے ہو' اپنی جگہوں سے اٹھ کر ناچتے کیوں نہیں؟ میں نے تم لوگوں کو ناچنے گانے' کھانے پینے اور جی بھر کے خوشیاں منانے کی دعوت دی ہے لیکن تم لوگ مرغی مرغوں کی طرح بیٹھے کڑکڑا رہے ہو۔"

"ہم ایبن کا انتظار کر رہے ہیں۔" وائلن نواز نے کہا۔

"ایبن کو جہنم میں جانے دو۔ میں پھر ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں' مجھے ایبن کی پروا نہیں ہے۔"

وہ نشے میں لڑکھڑا کر دو قدم آگے بڑھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ خواہ مخواہ ایبن کو نظروں سے گرا رہا ہے' اس نے جلدی سے بات بنائی۔

"بہرحال ایبن بھی میرا ہی خون ہے اور وہ تم سب سے بہتر ہے۔ وہ تمام دن کھیتوں میں محنت کرتا ہے۔"

وائلن نواز نے لقمہ دیا۔ "راتوں کو بھی محنت کرتا ہے۔"

ایک بار پھر فلک شگاف قہقہے گونجنے لگے۔ کیبوٹ نے غصے سے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"ہاں۔ وہ میری طرح دن رات محنت کرتا ہے۔ تم سب اس سے جلتے ہو' حسد کرتے ہو۔"

ایک بوڑھا شراب کا پیالہ ہاتھ میں لیے آگے بڑھا اور اس سے بولا۔ "میرے دوست! ہم ایبن سے حسد نہیں کرتے' تم پر رشک کرتے ہیں کہ تم پچھتر برس کی عمر میں باپ بن گئے۔ میں اڑسٹھ برس کا ہوں مگر مجھ میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔ اگر کسی طرح ایک بیٹا ہو بھی گیا تو مجھے شبہہ ہو گا۔"

"تم احمق ہو۔" کیبوٹ نے کہا۔ "تمہارے ہاں بھی بیٹا ہو سکتا ہے۔ تمہیں اپنے حوصلوں پر شبہہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں دوست! میں تو اپنے آپ پر شبہہ کروں گا مگر فکر نہ کرو' تم پر کوئی شبہہ نہیں

کرے گا۔"

قہقہے پھر گونجنے لگے اس کے ساتھ ہی وائلن بجنے لگا۔ چار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں لوک ناچ کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اِدھر اُدھر تھرکنے لگے لیکن ان کے قدم تال سے بے تال ہو رہے تھے۔ لڑکے نشے میں لڑکھڑا جاتے تھے اور لڑکیاں ان کی قربت سے رقص کے پینترے بھول جاتی تھیں۔

وائلن نواز بار بار انہیں ٹوک رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟ جم' پارٹنر بدل کر اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ لو۔ گھبراؤ نہیں' اس کی ماں نہیں دیکھ رہی ہے (قہقہے)

ایزی' اب تم روبی کے سامنے آگئی ہو۔ دیکھو' وہ کیسے سرخ ہوئی جا رہی ہے۔ زندگی مختصر ہے' محبت اس سے بھی زیادہ مختصر ہے۔ موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ (قہقہے)

سارہ! جب تک سانس ہے' تب تک آس ہے۔ شاباش تم اچھی جا رہی ہو اور روزی' تم دلہن کی طرح شرماتی ہوئی اپنے پارٹنر کی طرف کیوں جاتی ہو۔ شرماؤ نہیں۔ ایبی کی طرح دلیر بنو۔" (قہقہے)

کیبوٹ نشے میں چُور تھا' انہیں ناچتے اور خوشیاں مناتے دیکھ کر وہ بھی جوش میں آگیا اور موسیقی کی تال پر اپنے پاؤں زمین پر مارنے لگا۔

وائلن نواز نے دوسروں کی جانب آنکھ مار کر کیبوٹ سے کہا۔

"تم چھہتر برس کے بوڑھے ہو' جوانوں کا ساتھ نہیں دے سکو گے۔ خواہ مخواہ ٹانگ نہ اڑاؤ' ناچ کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

کیبوٹ نے غصے سے اچھل کر کہا۔ "یوشٹ اپ۔ تم مجھے بوڑھا اور کمزور سمجھتے ہو؟ میں ایسے دس جوانوں پر بھاری ہوں۔"

وہ جوشیلے انداز میں دونوں ہاتھوں کو لہراتا ہوا آگے بڑھا اور ناچنے والوں کو اِدھر اُدھر دھکیلتا ہوا بولا۔ "ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ تم سب موم کے پتلے ہو۔ میں ایک چٹان ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس طرح رقص کیا جاتا ہے۔ وائلن بجاؤ اور دیکھو کہ تمہارا ہاتھ تھک جاتا ہے یا میرے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ تمہاری انگلیاں کانپ جاتی ہیں یا میری سانس پھول جاتی ہے۔ بجاؤ........"

وائلن نواز نے دھن تیز کر دی۔ کیبوٹ ناچنے لگا۔

سب ہی کا خیال تھا کہ وہ بوڑھا ہے اور نشے میں ہے اس لیے فوراً ہی لڑکھڑا کر گر جائے گا لیکن اس کے رقص میں رفتہ رفتہ تیزی و تندی آنے لگی۔

وائلن نواز جان بوجھ کر رقص کی دھن تیز کر رہا تھا۔ کیبوٹ اتنی ہی تیزی سے پینترے بدل رہا تھا۔ کبھی دونوں ٹانگوں سے اچھل رہا تھا کبھی ایڑیوں پر گھوم رہا تھا اور کبھی تال سے تال ملا کر فرش پر جوتے کی ایڑیاں بجا رہا تھا اور ساتھ ہی چیخ چیخ کر کہتا جا رہا تھا۔

"ہوپ ہاہا۔ یہ ہے تمہارے لیے رقص کا ایک نمونہ۔ میں ایک چھہتر برس کا بوڑھا ناچ رہا ہوں۔ کس میں اتنا دم خم ہے کہ میرے ساتھ ناچ سکے۔

ہوپ ہاہا۔ میں تم لوگوں کو اپنی سویں سالگرہ پر ناچنے کی پیشگی دعوت دیتا ہوں لیکن اس وقت تک تم سب مر چکے ہو گے' کیونکہ تم کمزور نسل کے نوجوان ہو۔ تمہارے دل کمزور ہیں۔ تمہاری رگوں میں خون نہیں' صرف پانی اور کیچڑ ہے۔ میرے ساتھ ناچو گے تو تمہاری سانسیں پھول جائیں گی اور گھٹنے کانپنے لگیں گے۔

تم کیا جانو کہ قوت اور حوصلہ کیا چیز ہے۔ میں نے ریڈ انڈین حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس وقت تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ میری پیٹھ پر اب بھی تیر کے زخم کا نشان ہے لیکن میں نے تنہا تمام جنگلیوں کو مار بھگایا۔ میں ایک آہنی انسان ہوں۔ اپنی ایک ٹھوکر سے اس کمرے کی چھت اڑا سکتا ہوں۔ ہوپ ہاہا........"

وائلن نواز کا ہاتھ تھک گیا۔ انگلیاں کانپنے لگیں۔ اس نے وائلن کو ایک طرف رکھ کر شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "خدا تم سے سمجھے' تمہارے اندر شیطان ہے۔ ناچتے ہی جا رہے ہو۔"

کیبوٹ نے ہانپتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "تم ہار گئے کوئی بات نہیں۔ تم نے اچھا ساتھ دیا۔ آؤ میری جیت کی خوشی میں ایک جام پیو۔"

وہ مٹکے سے شراب نکالنے لگا۔ تمام لوگوں کی زبانیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ حیرت سے اس بوڑھے کو دیکھ رہے تھے۔ جو شبہہ ان کے دماغ میں مستحکم تھا' اب وہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔

اوپری منزل میں ایبن کی بے چینی اسے ایبی کی خوابگاہ تک لے آئی۔ وہ دروازہ کھول کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بچے کے پالنے کے پاس آگیا۔ اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب اس نے خوابیدہ بچے کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں

پر پیار کی ایک ملائم سی مسکراہٹ آگئی۔

"یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے۔ میں اس کا باپ ہوں۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اپنے دل کی بے چینی اس کی سمجھ میں آگئی۔ جس طرح یہ گھر' یہ زمین' یہ کھیت اس کی ماں کے تھے لیکن اس کے باپ سے منسوب ہو گئے تھے' اسی طرح یہ بچہ اس بوڑھے کے نام ہو رہا تھا۔

اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں اور وہ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ اسی وقت نچلی منزل میں ابی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ کمزوری کے باعث اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ نقاہت سے چلتی ہوئی کیبوٹ کے پاس آکر بولی۔ "میں بچے کے پاس جا رہی ہوں۔"

کیبوٹ نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ "تم تنہا سیڑھیاں نہیں چڑھ سکو گی' چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ بچے کو دیکھ کر ابھی واپس آجاؤں گی۔"

"تم مہمانوں کی فکر نہ کرو۔ بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے پاس رہو۔ وہ ہمارا بچہ ہے۔ ہم دونوں کا........"

یہ کہتے ہوئے اس نے ابی کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ وہ جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی اور کچن سے جانے لگی۔ اس کے کترانے کا یہ انداز دیکھ کر مہمانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کیبوٹ نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تو سب اچانک ہی خاموش ہو گئے۔

وہ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا بولا۔ "میں ذرا تازہ ہوا کے لیے باہر جا رہا ہوں' جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ تم لوگ ناچو گاؤ' جی بھر کے شراب پیو۔ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں ذرا تازہ دم ہو کر آتا ہوں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا اور اسے کھول کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وائلن نواز نے کہا۔

"تم نہ بھی آؤ تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

سب کے سب مسکرانے لگے۔ اس نے ابی کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "ہائے .... میرا بن........ کہاں ہے........"

تمام لوگ بے اختیار قہقہے لگانے لگے۔

کیبوٹ پورچ سے باہر آکر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ننھے ننھے ستارے تاریکی کو

دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس نے آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میری بوڑھی زندگی میں بھی ایسا ہی اندھیرا ہے۔

میں خود کو آہنی انسان کہہ کر' ڈینگیں مار کر' اور متواتر ناچ ناچ کر اس اندھیرے میں جوانی کی رمق پیدا کرنا چاہتا ہوں اور ہر بار جگنو کی طرح چمک کر بجھ جاتا ہوں۔

آہ........ میں نے پتھریلی زمین پر ہل چلائے ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔ یہ کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنی ٹھوکروں سے چٹانوں کو توڑ دیا کرتا تھا۔ اب کیسے مان لوں کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں........"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک آیا اور اس پر ہاتھ ٹیک کر ایسے جھک گیا جیسے کمر جھک گئی ہو۔

ابی اپنی خوابگاہ میں داخل ہوئی تو ایبن اس کی جانب پشت کیے پالنے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ وہ بچے کو اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔

"ایبن!"

وہ چونک کر پلٹ گیا۔ ابی نے اپنی بانہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔ ایبن نے خوش ہو کر اسے پیار کیا اور کہا۔

"دیکھو۔ یہ کتنا خوبصورت ہے۔"

"ہاں۔ بالکل تمہارے جیسا ہے۔"

وہ مایوسی سے بولا۔ "مگر میں کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ یہ میرا ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو' میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جو چیز میری ہے' اسے وہ بوڑھا چھین رہا ہے۔ میں کبھی اسے اپنا نہیں کہہ سکوں گا۔ کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے؟"

ابی نے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ "میرے اچھے ایبن! ابھی ہم دونوں مجبور ہیں لیکن یہ مجبوری سدا نہیں رہے گی۔ کیبوٹ ہماری عمر کے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ وہ چند روز کا مہمان ہے' پھر ہم آزاد ہو جائیں گے۔ میں اور یہ بچہ اور یہاں کی ہر چیز تمہاری ہو جائے گی۔ مجھے پیار کرو ایبن۔ میں تمہارے بیٹے کی ماں ہوں۔ مجھے پیار کرو۔"

"ہاں۔ تم میرے بیٹے کی ماں ہو۔ میری محبت ہو........" وہ اپنی محبت کو چومنے لگا۔

"میرے ایبن! میں تمہاری ہوں۔ میں زندگی کی ہر سانس تمہارے نام سے لے رہی ہوں۔ وہ ابی مر گئی جو یہاں زمینوں کی مالکہ بن کر آئی تھی۔ صرف تم ہی میری ملکیت ہو۔ میں تمہارے لیے ساری دنیا کو ٹھکرا دوں گی۔ وقت کا انتظار کرو ایبن......... چند روز......... صرف چند روز........."

وہ دونوں ایک دوسرے کے پیار میں جذب ہوتے چلے گئے۔

☆======☆======☆

ایبن پورچ سے باہر آکر آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ پہلے کیبوٹ نے بھی اسی طرح تاریک آسمان کے ننھے ننھے ستاروں کو دیکھا تھا اور بہت کچھ سوچتے ہوئے وہاں سے گزر گیا تھا۔ ایبن نے بھی سوچا کہ یہ آسمان پورے چاند کی چاندنی کا محتاج ہے اور ننھے ستاروں سے روشنی کی بھیک مانگ رہا ہے' جیسے میں چھوٹی چھوٹی مسرتیں اپنی زندگی سے مانگ رہا ہوں۔ مجھے ابی کی محبت کا مختصر سا لمحہ ملتا ہے' اپنے بچے کو دور سے دیکھنے کی ایک محدود خوشی ملتی ہے اور بس......... اس کے بعد ہر چیز پرائی ہو جاتی ہے۔

افسوس......... ہماری ہر خواہش تکمیل تک نہیں پہنچتی۔ تکمیل کے دوران ہی کہیں سے ٹوٹ جاتی ہے۔

اس وقت کیبوٹ کھلیان کی طرف سے آ رہا تھا۔ بیٹے کو وہاں دیکھ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور خوشی سے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جماتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو تم یہاں ہو؟"

ایبن نے چونک کر اسے دیکھا۔ کیبوٹ نے پوچھا۔ "تم ہماری خوشیوں میں شریک کیوں نہیں ہوئے۔ وہاں اب بھی تمام مہمان تمہیں پوچھ رہے ہیں۔"

"پوچھنے دو۔" اس نے بے دلی سے کہا اور مکان کی جانب دیکھنے لگا۔ کچن کی طرف سے اب تک ناچنے گانے اور ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیبوٹ نے مسکرا کر کہا۔

"مہمانوں میں ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں موجود ہیں۔"

"مجھے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"دلچسپی ہونی چاہیے۔ ایک دن کسی نہ کسی لڑکی سے تمہاری شادی ہو گی۔ شادی منافع کا سودا ہے۔ دلہن اپنے ساتھ کچھ زمین جائیداد لے کر ضرور آتی ہے۔"

ایبن نے تلخی سے کہا۔ "جیسے میری ماں لے کر آئی تھی۔ یہ سب میری ماں کی جائیداد ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ یہ زمینیں میری ہیں۔ تمہاری ماں کے رشتے دار مجھ سے یہ زمینیں چھیننے کی سازش کر رہے تھے۔"

"یہ صرف تم کہہ رہے ہو پاپا۔ ورنہ دوسرے لوگ یہی کہتے ہیں' جو میں کہہ رہا ہوں۔ بہرحال کوئی بات نہیں۔ میں زمینیں حاصل کر لوں گا۔"

"کون سی زمینیں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"یہ.........یہ.........!" ایبن نے زمین پر پاؤں مار کر کہا۔

کیبوٹ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ پھر اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "تم......... تم اور میری زمینیں حاصل کرو گے......... بے وقوف......... زمین پر رینگنے والے حقیر کیڑے......... میں تمہیں پیروں تلے کچل کر رکھ دوں گا۔"

"اونہہ!"

ایبن کی "اونہہ" میں ایک طنز تھا اور ایک ایسا اعتماد تھا جیسے وہ زمینیں چھین لینے کا منصوبہ بنا چکا ہو۔ کیبوٹ نے غصے سے پوچھا۔

"تم کس چکر میں ہو؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟ مم۔ مگر تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ تم اول درجے کے احمق ہو۔ تمہاری کھوپڑی میں ذرا سا بھی گودا نہیں ہے۔"

ایبن ایسی لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کی باتیں نہیں سن رہا ہو۔ کیبوٹ اور زیادہ بھڑک گیا۔

"تم پیدائشی گدھے ہو۔ تم......... تم میری زمینوں کا ایک کنکر' ایک تنکا بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میں پھر سے ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں۔ اگر میں مر گیا تو یہ سب کچھ اس بیٹے کے نام ہو گا۔

مگر میں نہیں مروں گا۔ تم لوگوں کو بے وقوف بنا کر رکھنے کے لیے سو سال تک زندہ رہوں گا۔ اس وقت تک میرا یہ بیٹا جوان ہو جائے گا........."

ایبن نے پھر طنزیہ انداز میں "اونہہ" کہہ دیا۔ اس بار کیبوٹ مارے غصے کے چیخنے لگا۔

"الو کے پٹھے! تم ضرور کوئی چال چل رہے ہو۔ اب میں سمجھ گیا ہوں۔ تم ابی کو

اپنی دشمن سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری ماں کی زمینوں پر قابض ہونے آگئی ہے۔ وہ بے چاری تم سے خوفزدہ رہتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس سے زبردستی محبت کا اظہار کرتے ہو۔ تمہاری نیت خراب ہے.........“

وہ چونک کر بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ ایبی میرے متعلق ایسا نہیں کہہ سکتی۔“

کیبوٹ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا‘ پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”یہ سچ ہے۔ ایبی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہو۔ یہ سنتے ہی تمہیں جوتے مار کر یہاں سے نکال دینا چاہتا تھا لیکن ایبی نے مجھے روک دیا۔ اس نے سمجھایا کہ اگر تم نکال دیے گئے تو تمہارے جیسا کھیتوں میں کام کرنے والا محنتی احمق کہیں نہیں ملے گا۔“

ایبن تلملا کر اسے گھورنے لگا۔ وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ کیبوٹ نے کہا۔

”پھر ایبی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے بیٹے کی ماں بنے گی اور جب بیٹا ہو گا تو میرے بعد وہ اور اس کا بیٹا میری زمینوں کے مالک بن جائیں گے اور تم راستے کی خاک چھانتے رہو گے۔“

ایبن غصے سے تھرتھر کانپنے لگا۔ بوڑھے نے قہقہہ لگایا۔

”ہاہاہا۔ دیکھ لو۔ وہ ماں بن گئی ہے۔ اس نے تمہیں شکست دی ہے۔ اب تمہاری کوئی چال کامیاب نہیں ہو گی۔ وہ اور اس کا بیٹا تمہاری آنکھوں کے سامنے ان زمینوں کے مالک بن جائیں گے۔“

وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ ”ایبی......... چڑیل......... مکار......... اب تک دوہری چال چل رہی تھی......... مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ میں۔ میں اسے مار ڈالوں گا......... جان سے مار ڈالوں گا.........“

وہ غصے سے پاگل ہو کر دروازے کی طرف جانے لگا لیکن کیبوٹ اچھل کر اس کے راستے میں آگیا۔

”تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“

”ہٹ جاؤ میرے راستے سے.........“

اس نے کیبوٹ کو ایک طرف دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ مگر دوبارہ آگے بڑھ کر

اس سے لپٹ گیا۔

پہلے پہل ان کی جدوجہد اسی حد تک تھی کہ ایک خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا اسے گرفت میں رکھنے کے لیے ہانپ رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ زور آزمائی جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ دونوں باپ بیٹے آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

کچن میں بچے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اس بچے کے دو دعویدار کتوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ دور سے سنائی دینے والی موسیقی اور قہقہے یوں لگ رہے تھے جیسے وہ لوگ ان کی ہنسی اڑا رہے ہوں۔

ایبن میں جوانی کا زور تھا مگر عقل نہیں تھی۔

کیبوٹ میں بڑھاپے کی کمزوری تھی لیکن داؤ پیچ استعمال کرنے کی عقل تھی۔

کسی بھی جنگ میں طاقت سے زیادہ داؤ پیچ سے شکست دی جاتی ہے۔ کیبوٹ لڑتے لڑتے ایبن کی گردن کو پیچھے سے دبوچنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی وقت ایبی مکان سے باہر آ رہی تھی۔ ان دونوں کو لڑتے دیکھ کر وہ چیختی ہوئی ان کی طرف لپکی۔

”چھوڑو......... ایبن کو چھوڑ دو......... ارے تم تو اس کا گلا گھونٹ رہے ہو۔“

وہ کیبوٹ کا ہاتھ کھینچ کر اس کی گردن سے الگ کرنے لگی۔ کیبوٹ نے خود ہی ڈھیل دے دی اور الگ ہونے سے پہلے ایبن کو دھکا دے کر زمین پر پھینک دیا۔

وہ گھاس پر گر کر کراہنے لگا۔ گردن دبوچنے کے باعث جو تکلیف ہو رہی تھی‘ اس کا اسے احساس نہیں تھا۔ اسے ایبی کی مکاری پر غصہ آ رہا تھا اور رونا بھی۔ وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

ایبی اس کے قریب آ کر دو زانو ہو گئی۔ اپنے محبوب کو روتے دیکھ کر اس کا دل اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو ایبن نے اسے پرے دھکیل دیا۔ کیبوٹ نے ہانپتے ہوئے تلخی سے کہا۔

ایبی! یہ نوجوان بوڑھوں کو کمزور سمجھتے ہیں......... اونہہ......... یہ چھبیس برس کا جوان ہے اور میں چھہتر برس کا بوڑھا ہوں مگر دیکھ لو کہ یہ میرے مقابلے میں زمین چاٹ رہا ہے۔“

یہ کہتے وقت فخر سے اس کا سینہ پھول گیا اور مرغے کی طرح گردن اکڑ گئی۔

"اونہہ......... موم کا پتلا پتھر سے ٹکرانا چاہتا تھا۔ اب اسے پتہ چل گیا ہے کہ میں ایک آہنی انسان ہوں......... اس خوشی میں مجھے ایک جام نوش کرنا چاہیے۔ مجھے آج جی بھر کے پینا' ناچنا اور گانا چاہیے۔"

وہ مکان کے اندر جانے کے لیے دروازے کے پاس آیا اور وہاں سے پلٹ کر بولا۔

"ہم سب گھر والے یہاں باہر ہیں اور باہر کے لوگ ہمارے گھر میں خوشیاں منا رہے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ چلو' ہمیں مہمانوں میں رہنا چاہیے۔"

ایبی نے ناگواری سے کہا۔ "تم دیکھتے نہیں کہ ایبن کی کیا حالت ہے۔ اگر مہمانوں کو اس جھگڑے کا علم ہو گیا تو وہ ہمارا مذاق اڑائیں گے تم جاؤ' میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "یہ کم بخت تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا تھا مگر میرا خیال ہے کہ اب اس کا دماغ درست ہو گیا ہے۔ ویسے یہ تم پر ہاتھ اٹھائے تو مجھے آواز دینا۔ میں اس کے ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر چلا گیا۔ ایبی نے بند دروازے کی جانب نفرت سے دیکھا' پھر ایبن کی طرف جھک کر ہمدردی اور محبت سے پوچھا۔ "کیا بات ہے ایبن؟ جھگڑا کیوں ہو رہا تھا؟"

"تم۔ تمہاری جیسی مکار عورت کے لیے........." وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو۔ تم مجھ سے نفرت نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری ایبی ہوں۔ تمہاری محبت ہوں۔"

وہ نفرت سے دانت پیستا ہوا بولا۔ "تم محبت نہیں' ایک فریب ہو۔ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ تم پیار کی میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے بے وقوف بناتی رہیں اور میں بنتا رہا مگر اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم دوہری چال چل رہی تھیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایبن کا ہاتھ تھام لیا۔ ایبن نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔ میں اب تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔ اب تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم محض ایک بیٹے کی ماں بننے کے

لیے محبت کا ناٹک کھیل رہی تھیں۔ تم اس بوڑھے کے لیے جائیداد کا ایک وارث اور میرا ایک دشمن پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ عورت مکاری پر اتر آئے تو شیطان کے بھی کان کاٹتی ہے۔ تم نے میرے ہی خون سے میرے ایک دشمن کو پیدا کیا ہے۔

تم......... تم نے پاپا سے وعدہ کیا تھا کہ ایک بیٹا پیدا کرو گی تاکہ وہ ان زمینوں کا مالک بن جائے اور میں راستے کی خاک چاٹتا رہا ہوں۔"

ایبی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ بات تمہارے پاپا نے کہی ہے؟"

"ہاں۔ انہوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے۔ تم اس سچائی سے انکار نہیں کر سکتیں۔"

"ایبن! یہ بات سچ ہے مگر جھوٹ بھی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم مجھ سے نفرت کرتے تھے' مجھے اپنی ماں کی دشمن سمجھتے تھے اور مجھ سے کترا کر منی کے پاس جایا کرتے تھے۔ میں نے انتقاماً تمہارے پاپا سے یہ باتیں کہہ دی تھیں مگر........."

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "اب انتقام لینے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تم مر جاتیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تمہارا بچہ مر جاتا........."

وہ تڑپ کر اس کے قدموں میں گر پڑی۔ "نہیں۔ ایسی خواہش نہ کرو۔ وہ تمہارا ہے۔ وہ میرا ہے۔ اس کے لئے برا نہ سوچو۔ میں نے کبھی تمہاری بربادی کے لیے نہیں سوچا۔ میں ہمیشہ تمہاری' اپنی اور بچے کی بھلائی کے لیے سوچتی ہوں۔"

اس نے منہ پھیر کر غصے سے کہا۔ "اب تمہارا جادو مجھ پر نہیں چلے گا۔ میں پاپا سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ تمہارے گناہوں کا علم ہوتے ہی وہ تم سے نمٹ لیں گے۔ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ کیلیفورنیا' جہاں سونے کی کانیں ہیں' جہاں میرے بھائی گئے ہیں۔ میں بھی چلا جاؤں گا۔"

وہ قدموں سے لپٹ کر بولی۔ "نہیں۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

"میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ وہاں جا کر لوگ دولت مند بن جاتے ہیں۔ جب میرے پاس بھی پاپا سے مقدمہ لڑنے کے لیے دولت جمع ہو جائے گی تو میں اپنی ماں کی زمینوں کے لیے اسے عدالت میں چیلنج کروں گا اور یہ زمینیں حاصل کرنے کے بعد تمہیں اور اس بوڑھے کو دھکے دے کر نکال دوں گا۔ تم دونوں اس بچے کے ساتھ سڑکوں پر بھیک مانگو گے۔ تمہارا بچہ بھوک اور بیماری سے مر جائے گا۔"

"وہ تمہارا بچہ ہے ایبن!"

"لعنت ہے اس کی پیدائش پر........ یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے کہ وہ مر جائے۔ اسی لمحہ مرجائے۔ تم نے محض اپنے مقصد کے لیے اسے پیدا کیا ہے۔"

ایبی نے اس کے قدموں سے سر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے میں نے تمہیں دل سے نہیں چاہا تھا؟"

"ہاں۔ تمہاری محبت ایسی ہی تھی جیسے کسان اپنے بیل سے محبت کرتا ہے۔"

"کیا تم بھی مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے؟"

"میری محبت میں سچائی تھی۔"

"اور اب؟"

"اب میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "کیا تم مجھے سچ مچ چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ کیا مجھے صرف اس لیے چھوڑ دو گے کہ میں نے ایک بیٹا پیدا کیا ہے؟"

"ہاں۔ میں صبح ہی چلا جاؤں گا۔ جہنم میں چلا جاؤں گا۔"

ایبی کے چہرے پر اچانک سختی سی آگئی۔ اس کی دونوں مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ بڑے ہی ٹھوس اور مستحکم لہجے میں بولی۔ "اگر وہ پیدا ہو کر تمہارے دل سے میری محبت کو کچل رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے الگ کر رہا ہے تو میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ تم میری زندگی ہو۔ میرا ایمان ہو۔ میری وہ خوشی ہو' جس کے لیے عورت ساری زندگی بھٹکتی رہتی ہے' جس کے لیے عورت اپنے خاوند کو چھوڑ دیتی ہے۔ تہذیب کے بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد سے بھی منہ موڑ لیتی ہے۔

میں اس بچے کو چھوڑ سکتی ہوں مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر تم اس سے نفرت کرتے ہو تو میں بھی اس سے نفرت کرتی ہوں۔"

"تم جھوٹی ہو۔ تم اس سے محبت کرتی ہو' کیونکہ وہ بڑا ہو کر تمہارے لیے میری ماں کی زمینوں پر قبضہ کرے گا مگر........ جبکہ میں یہاں سے جا رہا ہوں تو مجھے ان زمینوں سے کچھ نہیں لینا ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے۔ کہ تم نے محبت کے نام پر مجھے دھوکہ دیا ہے۔"

"میں نے دھوکہ نہیں دیا ہے۔ میں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے اسے تمہارے

راستے سے ہٹا دوں گی مگر تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"محبت کا نشہ اتر گیا ہے' اب مجھے شراب کا نشہ چاہیے۔ میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر پیوں گا اور اپنی ناکامیوں پر دل کھول کر قہقہے لگاؤں گا سنا ہے کہ شراب روتوں کو ہنساتی ہے۔"

ایبی گردن میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔

"رک جاؤ ایبن! پہلے میری باتوں کا جواب دو۔ اگر وہ بچہ ہمارے درمیان نہیں آئے گا۔ اگر میں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تمہاری ماں کی زمینوں پر قابض نہیں ہو گا........ اور میں ثابت کر کے دکھاؤں گی۔ تو۔ تو کیا تم پہلے جیسی محبت کرو گے؟ مجھے اسی طرح بانہوں میں لے کر پیار کرو گے؟ اسی طرح مجھے پیار سے "میری ایبی" کہو گے؟ اس کے بعد........ اس کے بعد تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے نا؟"

اس نے ایبی کی بانہوں کو اپنی گردن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ جب مجھے تمہاری محبت کا یقین ہو جائے گا تو میں نہیں جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا اور تیزی سے چلتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ ایبی نے کہا۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ میں ثابت کر دوں گی کہ تم مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہو۔"

ایبن نے اپنے پیچھے ایبی کی آواز سنی مگر کوئی جواب دیے بغیر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

رات کا ہنگامہ سرد ہو چکا تھا۔ مہمان جا چکے تھے۔ ایبن کچن میں تنہا ایک میز پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس پر نشہ اور نیم غنودگی طاری تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ وہیں بیٹھے بیٹھے نشے کی حالت میں سو جاتا لیکن ایبی کا نشہ بہت تیز تھا۔ اس سے دور ہو جانے کا خیال دل میں کچوکے لگا رہا تھا اور شراب کے نشے کو پانی کر رہا تھا۔

کسی دم میں صبح ہونے والی تھی۔

ایبی اپنی خوابگاہ میں بچے کے پالنے پر جھکی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے سے بلا کی درندگی اور سفاکی جھلک رہی تھی۔ جب وہ پالنے کے پاس سیدھی کھڑی ہو گئی تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کے ہونٹ ایسے کانپنے لگے جیسے وہ آنسوؤں کو

روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ چہرہ ایک دم سے بجھ گیا۔ وہ پالنے سے ذرا دور ہوئی تو ہزار ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی وقت کیبوٹ نے نیند کے دوران بستر پر کروٹ بدلی۔ نشے کی حالت میں کچھ بڑبڑایا اور پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔ ایبی نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے تاکہ سسکنے کی آواز کیبوٹ تک نہ پہنچے۔ پھر وہ تیزی سے پلٹ کر خوابگاہ سے باہر جانے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایبن کو تلاش کرتی ہوئی کچن میں آئی۔ وہ خاموش بیٹھا سامنے دیوار کو گھور رہا تھا۔ ایبی کی آمد پر جوں کا توں بیٹھا رہا۔ وہ دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور دیوانہ وار اسے چومتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں نے ثابت کر دیا ہے......... میں نے ثابت کر دیا ہے کہ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ اب ہماری محبت کے راستے میں کوئی نہیں آئے گا۔“

ایبن کو اس کے پیار کی گرمی پگھلا نہ سکی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب اس محبت کو بھول جاؤ۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”نہیں۔ تم نہیں جا سکتے۔ میں نے تمہارے لیے اتنی بڑی قربانی دی ہے کہ آئندہ کبھی تم مجھ پر شبہہ نہیں کرو گے۔“

”فضول ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کس بات سے ڈرتی ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں پاپا سے نہیں کہوں گا کہ وہ میرا بچہ ہے۔ میں یہاں سے چپ چاپ چلا جاؤں گا۔“

وہ اس کے شانے کو جھنجھوڑ کر بولی۔ ”تم نہیں جا سکتے۔ نہیں جا سکتے۔ تمہیں روکنے کے لیے میں نے اسے مار ڈالا ہے۔“

ایبن حیرت سے تھرا گیا۔

”مار ڈالا ہے؟“ پھر وہ جوشیلے انداز میں ایبی کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”تو پھر جلدی کرو۔ ہمیں کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی موت قدرتی معلوم ہو۔ وہ رات سے بے تحاشہ پی رہا ہے۔ ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ بہت زیادہ پینے کی وجہ سے اس بوڑھے کی موت واقع ہو گئی ہے۔“

ایبی نے چونک کر اسے دیکھا‘ پھر پریشان ہو کر بولی۔ ”کیا تم......... تم اس بوڑھے کو راستے سے ہٹانا چاہتے تھے؟“

”ہاں!“

”مگر......... مگر میں نے تو اسے مار ڈالا ہے۔ اسے......... بچے کو.........“

ایبن اچھل کر کھڑا ہو گیا اور گرج کر بولا۔ ”کیا بکتی ہو؟“

وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں نے وہی کیا‘ جو تم چاہتے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ وہ بچہ تمہارا دشمن ہے۔ تم نے خواہش کی تھی کہ وہ مر جائے۔ اسی لمحہ مر جائے۔ وہ دشمن مر گیا ایبن‘ جو تمہاری ماں کی زمینوں پر قابض ہونے والا تھا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ میں نے اس کے مرنے کی خواہش کی نہیں تھی۔ تم جھوٹی ہو۔ میں تمہاری چالاکی سمجھتا ہوں۔ تم اس کی موت کی وجہ مجھے بتا رہی ہو‘ مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔ تم......... تم خود اس سے بیزار ہو گئی تھیں اس لیے کہ وہ میرا تھا۔ بالکل میرے جیسا تھا۔ وہ یہاں کی زمینوں پر قابض ہوتا تب بھی میرا ہی ہوتا اور تم یہ نہیں چاہتی تھیں۔ میری احمقانہ محبت کی جو نشانی رہ گئی تھی‘ تم نے اسے بھی مٹا دیا۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ تم ماں نہیں‘ ڈائن ہو۔ میں تم پر تھوکتا ہوں۔“

وہ اپنے بالوں کو نوچتی ہوئی بین کرنے لگی۔ ”ہائے۔ میں نے یہ کیا کیا۔ خدا گواہ ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ ہائے وہ کتنا خوبصورت بچہ تھا۔ بالکل تمہارے جیسا تھا......... مگر میں کیا کروں۔ تم نے مجھے الزام دیا کہ میں نے تمہارے ہی خون سے تمہارا دشمن پیدا کیا ہے۔ عورت پیدا کرے‘ تب بھی دشمن ہے‘ مار ڈالے تب بھی دشمن ہے۔ بتاؤ میں کیا کرتی؟ تمہیں جانے سے کیسے روکتی؟ تمہارے پیروں میں کیسے زنجیر پہناتی؟ محبت‘ وفاداری اور قربانی کی اس سے بڑی مثال میں پیش نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو میری محبت کا یقین کر لو میرے سنگدل محبوب.........“

”محبت!“ ایبن نے دانت پیس کر کہا۔ ”محبت کا نام لے کر تم نے پاپا سے شادی کی اور اسے دھوکا دیا۔ محبت کی میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے بھی احمق بنایا۔ جس محبت سے اس بچے کو جنم دیا‘ اسی محبت کی آڑ لے کر اسے مار ڈالا۔ تم قاتل ہو......... میرے بچے کی قاتل......... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں تمہیں قانون کے حوالے کروں گا۔ میں ابھی پولیس چوکی جا کر انسپکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔ تمہارا برا انجام تمہارے سامنے ضرور آئے گا.........“

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا جانے لگا۔

"ایبن! رک جاؤ۔ میں کسی قانون سے نہیں ڈرتی۔ سزا دینا ہے تو اپنے ہاتھوں سے دو........"

اس کے قدم نہیں رکے۔ وہ دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرتا ہوا چلا گیا۔

ایبی میز کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ گئی اور آنسو بھری آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھتی ہوئی بڑبڑانے لگی۔ "ایبن! مجھ سے نفرت نہ کرو۔

میں وہی ہوں ایبن! جس نے تمہارے بیٹے کو اپنی کوکھ میں رکھا۔ دنیا' سماج' رسم و رواج اور تہذیب' سب سے بغاوت کی۔ صرف تمہارے لیے۔ میں نے تمہارے لیے جتنی لگن سے اسے جنم دیا' اتنی ہی لگن سے تمہاری خاطر اسے ختم کر دیا۔

تم مجھے دوراہے پر کیوں لائے تھے؟ تمہارے جانے کی ضد ایسی تھی کہ ایک ماں اپنے بچے کی قربانی دے کر ہی تمہارے پاؤں میں زنجیریں ڈال سکتی تھی........ مگر تم نہیں سمجھتے........ تم مجھ سے نفرت کر رہے ہو۔ نفرت نہ کرو ایبن........ ایک بار پیار سے "میری ایبی" کہہ دو۔ میں ابھی........ اسی وقت خوشی سے مر جاؤں گی........"

وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

ہولے ہولے وقت گزرنے لگا۔ دھیرے دھیرے صبح ہونے لگی۔ سورج کی چمکیلی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ کیبوٹ بڑبڑاتے ہوئے بستر سے اٹھ گیا۔

"اوہ! دھوپ نکل آئی ہے اور میں ابھی تک بستر پر پڑا ہوں۔ ایبی کہاں ہے۔ اس نے بھی مجھے نہیں اٹھایا۔ شاید کچن میں ناشتہ تیار کر رہی ہے۔"

وہ قمیض پہن کر پالنے کے پاس آیا۔ بچہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو برخوردار! بڑی میٹھی نیند سو رہے ہو۔ بڑے سمجھدار ہو۔ دوسرے بچوں کی طرح صبح سویرے اٹھ کر ماں باپ کو پریشان نہیں کرتے ہو۔ اچھی بات ہے۔ سوتے رہو' جب تک تمہاری ماں میرے لیے ناشتہ تیار کر لے گی۔"

وہ مسکراتا ہوا خوابگاہ سے باہر آ گیا۔

نچلی منزل میں پہنچ کر جب وہ کچن میں داخل ہوا تو ایبی میز سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور زلفیں چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کیبوٹ نے پوچھا۔

"تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

"تم یہاں کیوں آ گئیں۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔ جاؤ' بچے کے پاس رہو۔ ذرا جا کر دیکھو' وہ کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے۔"

"وہ ہمیشہ سوتا رہے گا۔"

کیبوٹ نے مسکرا کر کہا۔ "تم کیسا بے تکا مذاق کر رہی ہو۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ وہ مر چکا ہے۔"

"کیا؟" وہ چونک کر اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"

"تم کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟"

وہ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بولی۔ "میں پاگل نہیں ہوں' پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے ہمیشہ کے لیے سلا دیا ہے۔ یقین نہیں ہے تو جا کر دیکھ لو۔"

اس نے ایسے ٹھوس لہجے میں یہ بات کہی کہ کیبوٹ ایک ساعت کے لیے سکتے میں آ گیا۔ پھر وہ تیزی سے پلٹ کر دروازے کو ایک جھٹکے سے کھولتے ہوئے اوپری منزل کی جانب جانے لگا۔

ایبی پہلے کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اب اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اسے صرف اپنے محبوب کا انتظار تھا۔

تھوڑی دیر میں بوڑھا کیبوٹ حیرانی' پریشانی اور غصے سے کانپتا ہوا آیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اوہ خدایا۔ یہ کیا ہو گیا؟ ایبی تم نے ایسا کیوں کیا۔ بولو' تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ خاموش رہی۔ کیبوٹ نے جھک کر اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "جواب دو۔ بولو۔ ورنہ میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ تم نے میرے بچے........"

ایبی نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور اسے پرے دھکیلتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر حقارت سے بولی۔ "خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا

کہ میرے جسم کو ہاتھ لگاؤ۔ تم میرے کوئی نہیں ہو۔ تم......... تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارا بچہ تھا؟ میں......... میں اور تمہارے بچے کو جنم دوں گی؟ تھو۔ اس سے پہلے مر نہ جاتی۔ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔ میں نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ میں ایبن سے محبت کرتی ہوں۔ جب سے میں یہاں آئی ہوں تبھی سے وہ میرے جسم و جان کا مالک بنا رہا اور مرتے دم تک رہے گا۔ وہ بچہ ایبن کا تھا۔"

کیبوٹ زندگی میں پہلی بار کمر کی طرف سے جھک گیا' جسے بھاگتی ہوئی عمر نہ جھکا سکی اسے ایک عورت نے جھکا دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ بوڑھی اور بینائی سے کمزور آنکھوں کو سکیڑ کر بولا۔

"اچھا۔ تو یہ بات ہے۔ تم دونوں میرے بڑھاپے کا مذاق اڑا رہے ہو۔ اب سمجھ میں آیا کہ بستی کے لوگ مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں کیوں مسکراتے ہیں۔ ذومعنی فقرے کیوں کہتے ہیں۔ مجھے کچھ کچھ شبہہ ہو چلا تھا مگر میں خوش فہمی میں مبتلا رہا۔

اچھا ہوا کہ وہ مر گیا۔ وہ ایبن کا تھا۔ اسے مرنا ہی چاہیے تھا۔ ورنہ کسی دن میرا شبہہ یقین میں بدلتا تو میں ہی اسے مار ڈالتا۔ اچھا ہوا کہ میں ایک جرم سے بچ گیا مگر تم نہیں بچو گی۔ میں تمہیں قانون کے حوالے کروں گا۔ میں ابھی جا کر انسپکٹر کو بلاتا ہوں........."

وہ کچن سے باہر جانے لگا۔

"تم تکلیف نہ کرو۔" ابی نے کہا۔ "ایبن یہ فرض ادا کرنے گیا ہے۔"

اس نے دروازے سے پلٹ کر حیرانی سے پوچھا۔

"ایبن گیا ہے؟ وہ اور تمہارے خلاف رپورٹ کرنے گیا ہے؟"

"ہاں!"

"چلو اچھا ہے۔ میں اتنی دور جانے اور آنے کی زحمت سے بچ گیا مگر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس سے تم محبت کرتی ہو' وہی تمہیں قانون کے حوالے کر رہا ہے۔"

"یہ بھی پیار کی ایک ادا ہے جسے تم نہیں سمجھو گے۔"

"میں تو کچھ نہیں سمجھتا۔ اگر سمجھتا تو بڑھاپے میں شادی نہ کرتا۔"

وہ غصے سے جھنجلاتا ہوا اور اپنی غلطی پر پچھتاتا ہوا مکان سے باہر آ گیا۔

باہر ایبن دوڑتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ کیبوٹ نے اس کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے

پوچھا۔ "کیا انسپکٹر آ رہا ہے؟"

"ہاں!"

کیبوٹ نے حقارت سے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جب انسپکٹر اس حرافہ کو لے کر یہاں سے چلا جائے تو تم بھی ہمیشہ کے لیے چلے جانا۔ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

ایبن اس کی باتوں کا جواب دیئے بغیر دوڑتا ہوا مکان کے اندر آیا اسے دیکھتے ہی ابی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی۔

ایبن خلافِ توقع اس کے قریب آ کر دو زانو ہو گیا اور اس کی گود میں سر رکھ کر بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔ ابی! میں تم سے محبت کرتا ہوں' میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ مارے خوشی کے اس سے لپٹ گئی اور اسے دیوانہ وار چومتی ہوئی بولی۔ "تم اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ ہائے ایبن! میں خوشی سے مر جاؤں گی......... تم نے مجھے ایسی خوشی دی ہے کہ اب میں سارے غم بھول جاؤں گی۔ مجھے پیار کرو ایبن......... مجھے پیار کرو........."

وہ ہچکچاتا ہوا بولا۔ "مم......... مگر ابی! میں نے انسپکٹر سے کہہ دیا ہے' وہ آتا ہی ہو گا۔"

"آنے دو۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ تم مجھے محبت سے پھانسی کے تختے پر لے جاؤ گے تب بھی میں تم سے شکایت نہیں کروں گی۔"

"مجھ سے بڑی بھول ہوئی ابی! انسپکٹر سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگا کر ساری باتیں کہہ دیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں باہر انتظار کروں۔ اسے لباس بدل کر تیار ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں باہر آ کر انتظار کرنے لگا اور تمہارے متعلق سوچنے لگا۔ میں جتنا سوچتا گیا' اتنا ہی تمہاری محبت کا یقین ہوتا گیا۔

میں سچ مچ احمق ہوں۔ میں بھول گیا تھا کہ تم کس طرح دیوانگی کی حد تک مجھے چاہتی ہو۔

اور جب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ تم نے محض مجھے روکنے کے لیے اور مجھے اپنے کلیجے سے لگا کر رکھنے کے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے تو میرے دل کی عجیب حالت ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے تم میرے اندر بیٹھی رو رہی ہو اور مجھے پکار رہی ہو۔ میں وہاں سے فوراً ہی بھاگ آیا۔ فاصلے کو مختصر کرنے کے لیے میدانوں سے اور جنگلوں سے گزر کر

دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ چلو ایبی! ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ انسپکٹر کے آنے تک کہیں دور نکل جائیں گے۔"

"نہیں ایبن! مجھے اپنے کیے کی سزا پانے دو۔"

"تو پھر تمہارے ساتھ میں بھی سزا کا مستحق ہوں۔"

"نہیں تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"میں نے کیا ہے۔ میں تمہارے اس جرم کا شریک رہا ہوں۔ میں نے ہی بچے سے نفرت ظاہر کی تھی۔ میں نے تمہیں آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ تمہیں اس جرم کے لیے مجبور کیا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ تم میری محبت سے مجبور ہو کر ایسا کہہ رہے ہو۔ ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میرے ساتھ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔"

"زندگی اس وقت برباد ہو گی جب تم جیل چلی جاؤ گی اور میں تنہا رہ جاؤں گا۔ تمہارے بغیر جو زندگی ملے گی' وہ موت سے بدتر ہو گی۔ نہیں ایبی! میں تمہارے ساتھ سزا پاؤں گا' تمہارے ساتھ جیوں گا اور تمہارے ساتھ مروں گا۔"

اس نے ایبی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ ننھی بچی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایبن اسے سمجھا رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کو چوم رہا تھا اور ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رہا تھا۔

پھر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی انہوں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ ایبی نے روتے روتے اپنے محبوب کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ ایبن اپنے ہونٹوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

کیبوٹ' انسپکٹر اور دو سپاہی دروازے پر ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ کیبوٹ نے غصے سے کہا۔

"انسپکٹر! یہ ہیں دونوں بے شرم......... بدکار مجرم......... انہیں ایسی سزا دو کہ دوسرے نوجوان عبرت حاصل کریں۔ ان کی بے حیائی کی داستان کو دور دور تک پہنچا دو تاکہ مجھ جیسے دوسرے بوڑھوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ بڑھاپے میں جوان عورت سے شادی کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

ایبی نے آہستگی سے کہا۔ "ایبن! یہ ٹھیک ہے ہم دونوں سزا پائیں گے۔ تبھی

ہماری محبت کی داستان دور تک پہنچے گی اور بوڑھے عبرت حاصل کریں گے۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور سر جھکا کر ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے مکان کے باہر آ گئے۔

باہر قلندیر کے درخت سایہ فگن تھے۔ اس سائے میں انہوں نے محبت کی ایک جنت بنائی تھی۔ تہذیب کے خلاف شجرِ ممنوعہ کی طرف گئے اور بڑے بے آبرو ہو کر اس جنت کے کوچے سے نکل رہے تھے۔

☆======☆======☆

آتشِ خرمن

ان لوگوں کی عبرت ناک کہانی
جو بیٹے کو اپنی آن اور شان سمجھتے ہیں
اور بیٹی پیدا ہونے سے ان کی سبکی ہو جاتی ہے۔
اس عاقبت نااندیش کا قصہ
جو اپنی بیٹی کو بیٹے پیدا کرنے کی مشین سمجھتا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کر بیڈ روم سے نکل کر فلیٹ کے بیرونی دروازے کے پاس پہنچا۔ ہاکر دروازے کے نیچے سے دو عدد اخبارات ڈال دیا کرتا تھا۔ ایک انگریزی اور دوسرا اردو' اس نے انگریزی اخبار کو ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل پر رکھا' اردو اخبار لے کر باتھ روم میں چلا آیا۔ اس وقت اس کی بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ اسے کوئی خوشخبری ملنے والی ہے۔ وہ خوش ہو کر گنگنانے لگا۔

وہ موٹر مکینک بھی تھا اور کار ڈیلر بھی۔ سوسائٹی میں ایک ہزار گز کے پلاٹ پر اس نے دو منزلہ عمارت بنائی تھی۔ نیچے دکانیں تھیں اوپر چار عدد فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ میں وہ رہتا تھا' باقی تین میں کرایہ دار تھے۔ نیچے کی دکانیں بھی اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔ ایک دکان میں اس نے پرانی کاروں کی خرید و فروخت کا دفتر کھول رکھا تھا۔ دوسری دکان میں گاڑیوں کی ریپیئرنگ کا کام ہوتا تھا۔ آج اسے دیکھنا یہ تھا کہ کون سی خوش خبری ملنے والی ہے۔ شاید کوئی بڑا گاہک پھنسنے والا تھا یا پھر میٹرنٹی ہوم سے اطلاع ملنے والی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔

وہ پہلے ہی چھ بیٹوں کا باپ تھا۔ اب ساتویں کی آمد تھی اور جب بھی کسی بچے کی آمد ہوتی' وہ بیوی کو سختی سے وارننگ دیتا تھا۔

"خبردار! بیٹی پیدا نہ کرنا ورنہ لات مار کر گھر سے نکال دوں گا۔"

یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی کہ عورت کو ہمیشہ ڈراتے دھمکاتے رہو اور اس کے دماغ میں یہ بات بٹھاتے رہو کہ بیٹا پیدا ہو گا۔ اگر بیٹی پیدا ہو گی تو تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ طلاق دے دے یا گھر سے نکال دے۔ پھر وہ گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی۔ عورت اگر جاہل ہو' اس کا شوہر کے سوا کوئی سہارا نہ ہو تو ایسی عورت کے دماغ میں مرد کی دھمکیاں نقش ہو جاتی ہیں اور وہ مرد کے مطالبے کے مطابق بیٹے کی پیدائش کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے۔

جس ملک میں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہو' ان پڑھ لوگوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو وہاں نیم حکیم آدھے ڈاکٹر اور ان پڑھ ماہرین نفسیات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مردم شماری کے مطابق ہمارے ملک میں پچھتر فیصد لوگ ان پڑھ ہیں اور پچیس فیصد جو تعلیم یافتہ ہیں' ان کی تعلیم بھی مشکوک ہے۔ کیونکہ مردم شماری کرنے والے جن گھروں میں جاتے ہیں۔ وہاں کسی کی سند یا سرٹیفکیٹ وغیرہ نہیں دیکھتے۔ جیسا لکھایا جاتا ہے' ویسا لکھ کر چلے آتے ہیں۔

حقیقتاً تعلیم کو سمجھ کر حاصل کرنے والوں اور صرف تعلیمی سند حاصل کرنے والوں کا صحیح حساب کیا جائے تو معلوم ہو گا' ہمارے ملک میں بمشکل ۵ فیصد تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔

وہ باتھ روم سے باہر آگیا۔ اتنی دیر میں اس نے اخبار کی موٹی موٹی اہم خبریں پڑھ لی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں آکر اس نے انگریزی اخبار کے صفحات کھولے۔ پھر اردو اخبار کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ان تصویروں کو انگریزی اخبار میں ڈھونڈنے لگا۔ وہ انگریزی اخبار پڑھنا نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ حکومت کی طرف سے جتنی خبریں اردو اخبارات میں شائع ہوتی ہیں' ٹھیک وہی خبریں انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ جو تصویریں اردو اخبارات میں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ بدلی ہوئی سہی مگر اسی موضوع کی تصاویر انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہوا کرتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ملنے جلنے والوں میں بیٹھ کر یہ تاثر دیتا تھا کہ وہ انگریزی جانتا ہے۔ انگریزی اخبار پڑھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انگریزی اخبار ڈرائنگ روم میں رکھتا تھا اور اردو اخبار بیڈ روم میں رکھتا تھا۔ لباس تبدیل کرنے تک چھوٹی مگر اہم خبریں بھی پڑھ لیتا تھا۔ پڑھنے کے بعد اس اردو اخبار کو الماری میں بند کر دیتا تھا۔

وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس طرح اردو زبان کو کمتر بنا رہا ہے۔ بات اگر مادری یا قومی زبان کی ہے تو اونچے طبقے کی مائیں اپنے بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں۔ بلکہ ڈبے کا دودھ پلاتی ہیں' تاکہ ان کے حسن میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔ اس طرح ماں کے دودھ کی توہین تو نہیں ہوتی؟ ان کے بچے بھی پرورش پا کر جوان ہوتے ہیں اور بڑے ہو کر اپنی ماں کو ماں کہتے ہیں۔ اسی طرح وہ انگریزی اخبار کا قاری بننے کے باوجود اپنی زبان کو مادری زبان ہی کہا کرتا تھا۔

آدمی کو ماحول کے مطابق ڈھلنا پڑتا ہے۔ بڑے لوگوں کی محفلوں میں ان کے طور

طریقے نہ اپنائے جائیں تو نیا آدمی بالکل الگ سی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ان کے درمیان عجوبہ سا نظر آتا ہے۔ اس نے سوسائٹی کے علاقے میں جب سے رہائش اختیار کی تھی اور کاروبار چل پڑا تھا' تب سے اس نے بیوی بچوں سے تقریباً علیحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ ضرورت کے وقت بیوی کے پاس جاتا تھا۔ بچوں سے ملتا تھا۔ ان کی ضروریات پوری کرتا تھا پھر اپنے فلیٹ میں آجاتا تھا۔ اگر بیوی بچے سوسائٹی جیسے علاقے کے شایانِ شان ہوتے تو یقیناً وہ انہیں اپنے ساتھ رکھتا۔ بیوی جاہل تھی' بچے بھی جاہل تھے۔ وہ خود پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اردو اس حد تک پڑھ سکتا تھا کہ اخبارات ضرور پڑھ لیتا تھا۔

جب اس نے خود کو اونچی سوسائٹی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تو وقت بہت گزر چکا تھا۔ وہ تنہا اپنے لیے کچھ کر سکتا تھا لیکن اپنے پورے گھر کو ایسا نہیں بنا سکتا تھا۔ اس نے ابتدا میں انگریزی کے موٹے موٹے حروف بولنے کی مشق شروع کی۔ پھر ایک دن ایک ادھیڑ عمر کی عیسائی عورت سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے اسے اپنا ٹیوٹر رکھ لیا۔ وہ روز دوپہر کو اس کے فلیٹ میں آتی تھی اور اسے انگریزی کے فقرے سکھاتی تھی۔ اس نے مشورہ دیا۔ "آپ باقاعدہ انگریزی پڑھنا شروع کر دیں۔"

وہ بولا۔ "میں بڈھا طوطا ہوں پڑھ نہیں سکوں گا۔ ہاں' اچھے اچھے جملے یاد کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے گاڑیوں کے لین دین کے بارے میں' گاڑیوں کی خرابی اور ان کی درستگی کے بارے میں جتنے جملے ہیں وہ مجھے سکھا دو باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔"

اس نے لباس بدلنے کے بعد آئینے میں خود کو دیکھا۔ وہ چھ چھ بیٹوں کا باپ تھا۔ ساتویں کا باپ بننے والا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ پھڑپھڑنے لگی۔ کوئی اسے پینتیس برس کا نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس وقت وہ پچیس برس کا گبرو جوان نظر آرہا تھا۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے باہر آکر دروازے کو کھولا۔ اس کا بارہ برس کا ایک بیٹا پپو کھڑا ہوا تھا۔ اس سے بڑا پندرہ برس کا تھا جو میٹرنٹی ہوم میں باپ تک اطلاع پہنچانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کوئی خبر آئی؟"

"نہیں ابا' وہاں راجو بھیا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ فون سے آپ کو بتائے گا۔"

"اچھا چلو' میں دکان کھول رہا ہوں۔"

وہ جانے لگا۔ پھر اس نے ڈانٹ کر بلایا۔ "ابے او پپو! ادھر آ۔"

وہ پلٹ کر آیا۔ باپ نے بیٹے کے کان کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "کتنی بار سمجھایا ہے' ابا

نہ بولا کر۔ ابا کہہ کر جب 'با' کہتا ہے تو بھاڑ کی طرح منہ کھل جاتا ہے۔"

"پھر کیا بولوں 'ابا'؟"

"پھر ابا۔ ابو نہیں کہہ سکتا؟"

"کتنی مرتبہ سوچا مگر بولتے وقت منہ سے ابا نکل جاتا ہے۔"

"گھر میں بولا کر۔ یہاں مجھے مخاطب کرنے کی کیا ضرورت ہے' دوسرے بچے مجھے ماسٹر کہتے ہیں تو بھی ماسٹر کیوں نہیں کہتا۔"

پپو سر جھکا کر سیڑھی سے اترتے ہوئے جانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اپنے باپ کو ماسٹر کیسے کہے۔ باپ تو بالکل ہی بدل گیا ہے۔ وہ کئی بار ابو کہنا چاہتا تھا مگر بچپن سے ابا کہنے کی عادت تھی' محلے کے بچے بھی اپنے اپنے باپ کو ابا کہتے تھے۔ جیسا ماحول تھا' جیسی عادت تھی ویسی ہی بات زبان سے نکلتی تھی۔

اس نے فلیٹ کے دروازے کو لاک کیا۔ پھر زینے سے اتر کر نیچے دفتر کے سامنے آیا۔ وہاں کارخانے میں کام کرنے والے چھوکروں کے ساتھ کاروں کا ایک دلال کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ "جمن! آج میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ کوئی بہت بڑی خوشخبری ملنے والی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے شٹر کے تالے میں چابی ڈالی' اسے کھولا۔ ایک ہی جھٹکے میں تالا کھل گیا۔ اس نے کہا۔ "دیکھا' یہ تالا روز مصیبت بن جاتا ہے۔ دو چار جھٹکے دینے کے بعد کھلتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا دن میرے لیے بہت اچھا ہے۔"

کارخانے میں کام کرنے والے چھوکرے نے کہا۔ "ماسٹر! پچھلی رات میں نے اس میں تیل ڈالا تھا۔ اس لیے یہ جلدی کھل گیا ہے۔"

ماسٹر نے اونہہ کہہ کر دوسرے تالے کو کھولا۔ پھر شٹر کو اٹھا دیا۔ شٹر اٹھتے ہی اندر سے خوشبو کا ایک جھونکا آیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "دیکھو دیکھو' آج کیسی خوشبو آ رہی ہے۔ قدرت کی طرف سے اشارے ہیں۔"

اس کے بیٹے پپو نے کہا۔ "کل رات بند کرنے سے پہلے میں اگر بتی جلا کر گیا تھا۔"

ماسٹر نے اپنے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ "جاؤ کارخانے کا دروازہ کھولو اور کام کرو۔"

دلال نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی بچوں پر ناراض کیوں ہوتے ہو۔ کبھی کبھی دائیں آنکھ بھی دھوکا دیتی ہے۔ محض خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے پھڑکتی ہے اور کچھ نہیں

ہوتا۔"

ایک چھوکرا دفتر میں آ کر صفائی کرنے لگا۔ دوسرا فرش پر جھاڑو دینے لگا۔ دلال نے کہا۔ "ماسٹر! اگر میرے کہنے کے مطابق سودا کرو تو شاید تمہاری دائیں آنکھ کے پھڑکنے کا مقصد پورا ہو جائے۔"

"کون سا سودا؟"

"وہی ڈاٹسن۔ دو ہفتے سے جہانگیر پارک پر کھڑی ہے گاہک آتے ہیں' ٹھوک بجا کے دیکھتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں۔ تمہاری دکان کے سامنے کھڑی ہو گی تو گاہک پر گاہک آئیں گے۔ اصل بات جگہ کی ہوتی ہے۔ اعتبار والی جگہ ہو تو آدمی آنکھ بند کر کے بھی چیز اٹھا لے جاتے ہیں۔"

ماسٹر نے کہا۔ "میں نے اپنی جگہ کا اعتبار اس طرح قائم نہیں کیا ہے کہ کھٹارا گاڑی لا کر کھڑی کر دوں اور گاہکوں کے اعتماد کو دھوکا دوں۔ نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں نے تم سے کہا نا کہ ڈاٹسن یہاں لے آؤ۔ میں اسے اندر سے پوری طرح ٹھیک کروں گا۔ اوپر سے اس کی ڈینٹنگ پینٹنگ کروں گا' جو اخراجات آئیں گے۔ اس کے مطابق اسے گاہکوں کے ہاتھ فروخت کروں گا۔ تمہارا مطالبہ دس ہزار کا ہے۔ تم دس جنم میں بھی اس ڈاٹسن کے دس ہزار روپے وصول نہیں کر سکو گے۔ میرے پاس لاؤ گے تو شاید تمہیں دس ہزار مل جائیں۔"

"میں لانے کو تیار ہوں مگر کچھ تو ایڈوانس دے دو۔"

"ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ پہلے اس گاڑی کو چالو کروں گا۔ اگر وہ چالو نہ ہوئی' گاہک نہ آئے تو کیا میں اپنے پیسے تمہارے پاس پھنسا دوں؟ ہرگز نہیں۔ اگر تمہیں منظور ہے تو پھر ڈاٹسن یہاں لا کر چھوڑ دو۔ اس کے بعد اپنی دائیں آنکھ کے پھڑکنے کا انتظار کرتے رہو۔"

وہ اپنے دفتر کے اندر آیا۔ باہر کھڑا ہوا دلال بڑبڑانے لگا۔ "یہ کیا تم نے دائیں آنکھ' دائیں آنکھ لگا رکھی ہے۔ جب کوئی خوشی نہ ملے تو ساری خوش فہمی خاک میں مل جاتی ہے۔ میں بزنس مین ہوں۔ بزنس کی باتیں کرو۔ چلو' دس ہزار نہیں' آٹھ ہزار لوں گا مگر دو ہزار پیشگی دے دو۔"

"میں کہہ چکا ہوں' ایک پیسہ نہیں۔ صبح سویرے میرا موڈ خراب نہ کرو۔"

دلال بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ لپک کر فون کے پاس گیا۔ فوراً ہی ریسیور اٹھایا تو اسے بیٹے کی آواز سنائی دی۔ وہ میٹرنٹی ہوم سے بول رہا تھا لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ بولنے لگا۔ "ہاں راجو' کیا بات ہے۔ کوئی خوشخبری سناؤ۔ دیکھو' اچھی خبر سنانا۔ ہاں' بولو کیا بات ہے۔ کیا تمہارا ننھا منا سا بھائی آیا ہے؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ اس نے پھر پوچھا۔ "تم چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"راجو نے کہا۔ "ابو! امی کی حالت بہت خراب ہے۔"

"ہاں' ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ تمہاری امی اچھی ہو جائیں گی۔ فکر نہ کرو۔ بتاؤ کیا ہوا؟"

"وہ ابو! بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں بہن آئی ہے۔"

دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ میز پر ایسے جھک گیا جیسے اچانک بڑھاپے نے دھاوا بول دیا ہو۔ آدمی ایسے وقت بے اختیار جھکتا ہے۔ جب خوش فہمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

"ہیلو ابو! ہیلو ہیلو۔" ریسیور سے آواز آ رہی تھی۔ وہ اس ریسیور کو گھور رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو یا تم نے سننے میں غلطی کی ہے۔ جاؤ اچھی طرح پوچھ کر آؤ۔"

"میں نے اچھی طرح پوچھ لیا ہے۔"

وہ تھوڑی دیر تک ریسیور کان سے لگائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے چونک کر کہا۔

"ارے یہ تو وہی میٹرنٹی ہوم ہے۔ دو سال پہلے اخبار میں خبر شائع ہوئی تھی کہ وہاں بچہ بدل دیا گیا ہے۔ ضرور میرے ساتھ کوئی گھپلا ہوا ہے۔ میرے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ ان نرسوں نے بچے کو بدل دیا ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ دھاندلی میرے ساتھ نہیں ہو سکے گی۔ میں اس میٹرنٹی ہوم میں آگ لگا دوں گا۔"

اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ غصے میں تیزی سے چلتا ہوا دفتر سے باہر آیا۔ پپو کو آواز دے کر بولا۔ "میں جا رہا ہوں............ تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ یہاں دفتر کے کسی چھوکرے کو بٹھا دو۔"

وہ ایک کار میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دفتر اور ورکشاپ کے سامنے بہت سی

گاڑیاں فروخت کے لیے اور مرمت کے لیے کھڑی رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک کار کو اسٹارٹ کر کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اگر اس کار کا مالک اسے کہیں راستے میں دیکھ لیتا۔ تب بھی اعتراض نہ کرتا۔ سب ماسٹر عبداللہ کو اچھی طرح جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک ماسٹر عبداللہ گاڑی کو ہر طرح سے چیک نہیں کر لیتا ہے اسے ٹرائل کے طور پر خود نہیں چلاتا' اس وقت تک گاہکوں کے حوالے سے نہیں کرتا ہے۔ ماسٹر عبداللہ پر سبھی اندھا اعتماد کرتے تھے۔

☆==========☆==========☆

آج سے پینتیس برس پہلے ماسٹر عبداللہ جب پیدا ہوا تو صرف عبدل تھا۔ وہ اپنے باپ سے سنتا آیا تھا کہ اس کے خاندان میں زیادہ بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔ بیٹیاں بس برائے نام پیدا ہوا کرتی تھیں اور جب ہوتی ہیں تو انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں کہیں نہ کہیں رشتہ ڈھونڈ کر انہیں گھر سے رخصت کر دیتے ہیں۔ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے' بیٹوں کی اہمیت ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ کیونکہ یہ کمانے والے ہاتھ ہوتے ہیں۔ باپ کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

عبدل کے باپ نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے پانچ برس کی عمر میں اسے ایک موٹر کے کارخانے میں کام پر لگا دیا تھا۔ وہ دو برس تک استاد کے پاؤں دابتا رہا۔ سر کی مالش کرتا رہا۔ اس کے گھر کے اوپری کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی کارخانے کا کام بھی کرتا رہا۔ پھر تیسرے برس سے وہ باقاعدہ کام کرنے لگا۔ بارہ برس کی عمر میں اچھا خاصا کاریگر بن گیا اسے ماہانہ تین سو روپے ملنے لگے۔ جب سترہ برس کا ہوا تو اس کی تنخواہ پانچ سو روپے ہو گئی۔ وہ بہترین کاریگر مانا جاتا تھا۔ جب پانچ سو روپے تنخواہ ہوئی تو باپ نے اس کی شادی کر دی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ خود ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔

شادی کی رات اس نے اپنی بیوی کو بڑے پیار سے دھمکی دی تھی۔ "اگر بیٹا پیدا نہ ہوا' تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔"

یہ دھمکی اس نے اپنے باپ سے وراثت میں حاصل کی تھی۔ دوسرے دن اس کی بیوی نے اپنے میکے والوں کو بلا لیا اور بتا دیا کہ اس کا مرد اسے چھوڑ دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ میکے والوں نے عبدل کو خوب برا بھلا کہا۔ بات بڑھتی گئی۔ لڑکی کے بھائی نے غصے سے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو' ہماری بہن ہم پر بھاری ہے۔ ہم اسے زندگی بھر بٹھا کر

کھلا سکتے ہیں مگر تمہیں اپنے ہاں قدم رکھنے نہیں دیں گے۔"

عبدل نے غصے سے کہا۔ "جاؤ جاؤ' اپنی بہن کو لے جاؤ۔ میں تمہارے ہاں تھوکنے بھی نہیں آؤں گا۔"

پنچ کے بوڑھوں نے دونوں طرف کے جوانوں کو ٹھنڈا کیا۔ انہیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھائے۔ پھر صلح صفائی کرا دی۔ دلہن عبدل کے پاس رہ گئی لیکن دو ماہ بعد پھر وہی جھگڑا شروع ہوا۔ اس بار اس کی بیوی غصے میں میکے چلی گئی۔ عبدل اسے لینے نہیں گیا اور نہ ہی میکے والوں نے اسے سسرال بھیجا۔ صرف اتنا کہلا دیا۔ "اگر اپنی دلہن کو لے جانا چاہتے ہو تو خود آکر لے جاؤ ورنہ یہ نہیں آئے گی۔"

عبدل نے جواباً کہلا بھیجا۔ "جب وہ شوہر کے بغیر میکے چلی گئی ہے تو شوہر کے بغیر ہی واپس آئے گی۔"

عبدل کی ماں نے سمجھایا۔ "ارے کم بخت ایسا جواب نہ دے۔ تجھے کچھ پتا بھی ہے' وہ تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"بننے والی ہے تو میں کیا کروں۔ میں اسے لینے نہیں جاؤں گا۔"

باپ نے کہا۔ "عبدل ٹھیک کہتا ہے۔ ہم اپنی ناک نیچی کیوں کریں۔ وہ جیسے گئی ہے ویسے ہی آئے گی۔"

اس دوران عبدل نے استاد کا گیراج چھوڑ دیا تھا۔ ایک حاجی صاحب کے گیراج میں کام مل گیا تھا۔ وہاں اسے ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔ وہ اتنا اچھا کاریگر تھا کہ اس گیراج میں سب اسے عبدل استاد کہنے لگے۔ حاجی صاحب اسے نصیحت کرتے تھے۔ "بیٹا! اللہ تعالٰی نے تمہاری محنت کا صلہ تمہیں دیا ہے۔ تمہارے پاس اچھا ہنر ہے لیکن اسے رزق حلال کے لیے استعمال کرو۔ کبھی کوئی بے ایمانی نہ کرو' حلال کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے۔"

عبدل کے ذہن میں یہ بات نقش ہو گئی تھی۔ اگر نصیحت کرنے والا خود بھی ایمان دار ہو اور اپنے اعمال کے ذریعے رزقِ حلال حاصل کرنے کا ثبوت فراہم کرتا ہو تو دوسرے یقیناً اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ عبدل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ جو لوگ چوری کا مال لاکر اونے پونے حاجی صاحب کے پاس بیچنا چاہتے تھے' وہ ایسے مال کو خریدنے سے انکار کر دیتے تھے۔ حالانکہ اس طرح انہیں ہزاروں روپے کا منافع ہو سکتا تھا لیکن وہ

ایسے منافع کو ٹھکرا دیتے تھے۔

آدمی بچپن میں اپنے باپ سے متاثر ہوتا ہے۔ کچھ بڑا ہوتا ہے تو استاد سے متاثر ہوتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے تو دنیا سے سبق حاصل کرتا رہتا ہے۔ عبدل پہلے تو باپ سے متاثر تھا۔ پھر وہ حاجی صاحب سے متاثر ہوا۔ انہوں نے نیکی کا جو درس دیا' اس نے اسے گرہ میں باندھ لیا لیکن ایک اور بات سے متاثر ہوا کہ حاجی صاحب کی تین بیویاں تھیں اور پندرہ بچے تھے جن میں لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی' لڑکیاں کم تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "حاجی صاحب! اگرچہ آپ کے ہاں لڑکیاں کم ہیں پھر بھی کافی ہیں۔ کیا آپ کو اس کا دکھ نہیں ہوتا؟"

"کس بات کا دکھ؟ لڑکیاں تو نصیب آور ہوتی ہیں۔ پھر یہ سب خدا کی دین ہے۔ اس دین سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ جو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بچے کم سے کم پیدا کرنا چاہئیں۔"

"وہ کفر بکتے ہیں۔ ان سے پوچھو' کیا وہ اپنی مرضی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوا نا کہ یہ اللہ کی دین ہے۔ ہم اور تم اللہ کی دین سے انکار کرنے والے کون ہوتے ہیں؟"

دس ماہ کے بعد عبدل کے سسرال سے اطلاع آئی کہ اس کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے والد بھی خوشی سے بے چین ہو کر کہنے لگے۔ "ہم ابھی بہو کے پاس جائیں گے۔"

عبدل کی ماں نے کہا۔ "کیا اب جاتے ہوئے ناک نہیں کٹے گی؟"

اس کے باپ نے کہا۔ "وہ زچہ خانے میں ہے۔ ہم اس کے میکے تو نہیں جا رہے ہیں۔"

وہ سب زچہ خانے پہنچ گئے۔ ساس نے بہو کی بلائیں لیں۔ سسر نے دعائیں دیں۔ عبدل نے بیوی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "صابرہ! ہمارا جھگڑا ختم ہو گیا۔ گھر چلو گی۔"

صابرہ نے سر کو جھکا لیا۔ وہ اتنے دنوں تک اپنے میکے میں رہ کر سمجھ گئی تھی کہ گزارا سسرال میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے بھائی غیرت کے جوش میں آکر اسے لے تو آئے تھے لیکن بوجھ سمجھتے تھے۔ بھابیاں بھی اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی تھیں۔ محلے کی بوڑھیاں مشورے دیتی تھیں کہ سبھی مرد شروع شروع میں تیس مار خاں ہوتے ہیں۔ بعد میں اولاد

کی محبت انہیں زنجیر سے باندھ لیتی ہے۔ ماشاء اللہ تم ماں بننے والی ہو۔ دیکھ لینا' وہ سر کے بل تمہارے پاس آئے گا۔"

اور یہی ہوا۔ وہ اسے لینے زچہ خانے آیا تھا۔ وہ راضی خوشی سسرال چلی گئی۔ اس کے والدین نہیں تھے میکے سے بھائیوں اور بھابیوں اور دوسرے رشتے داروں نے بھی اسے کبھی نہیں بلایا۔ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ شوہر سے ذرا بھی جھگڑا ہو گا اور وہ صابرہ کو لے آئیں گے تو عبدل بڑا ڈھیٹ ہے' کبھی اسے واپس لینے نہیں آئے گا اور صابرہ تمام عمر کے لیے ان پر بوجھ بنی رہے گی۔

دوسرے سال وہ پھر ماں بننے والی تھی۔ اس بار بھی عبدل نے اسے دھمکی دی۔

"دیکھو محبت سے سمجھا رہا ہوں۔ بیٹے کے متعلق سوچتی رہو اور بیٹا پیدا کرو۔"

وہ سمجھ گیا تھا کہ صابرہ کے میکے والے کتنے پانی میں ہیں۔ اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے۔ وہ بے چاری اب سہمی سہمی رہنے لگی تھی۔ ویسے نصیب کی بھلی تھی۔ دوسری بار بھی بیٹا ہی پیدا ہوا۔ شوہر برا نہیں تھا۔ ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ کھانے' پینے' پہننے کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی ہر ضرورت پوری کرتا تھا۔ بس اولاد کے معاملے میں پتھر تھا۔ ابھی ایک بچے کو ماں کا دودھ پورا نہیں پڑتا تھا کہ دوسرے کی آمد کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ پانچ برس کے عرصے میں تین بیٹے پیدا ہو گئے۔

اس دوران عبدل کی کایا پلٹ گئی۔ ہوا یہ کہ ایک دن گیراج کے حاجی صاحب چالیس ہزار روپے لے کر آئے۔ ان کا چھوٹا سا بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت اچھی گاڑی کا سودا کر رہے تھے۔ اسی گاڑی کو چالیس ہزار میں خرید کر کم سے کم پچپن ہزار یا ساٹھ ہزار تک بیچ سکتے تھے۔ وہ بریف کیس لے کر کارخانے میں آئے۔ وہاں ان کا ایک چھوٹا سا دفتر بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اس دفتر کے اندر جا کر میز پر بریف کیس کو رکھ دیا۔ باہر آکر لڑکوں سے پوچھا۔ "کیا عبدل نہیں آیا؟"

ایک لڑکے نے کہا۔ "استاد کا پتا نہیں ہے۔ وہ تو سب سے پہلے آجاتے ہیں۔ آج نہیں آئے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم لوگ بھی چھٹی کرو۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

لڑکے باہر پھیلا سامان سمیٹ کر گیراج میں لے آئے۔ شٹر کو گرا دیا۔ صرف ایک شٹر کھلا رکھا تاکہ حاجی صاحب باہر نکل سکیں۔ انہوں نے کہا۔ "تم سب جاؤ۔ میں اسے بند کر

کے چلا جاؤں گا۔"

وہ چلے گئے۔ حاجی صاحب اپنے دفتر میں آئے۔ وہاں لیٹر پیڈ نکال کر ایک نئی گاڑی خریدنے کے سلسلے میں معاہدہ لکھنا شروع کیا۔ اسی وقت انہیں دل کا دورہ پڑا۔ وہ ایک دم سے دل تھام کر میز پر جھک گئے۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ منہ سے کچھ بولنا چاہتے تھے مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اسی وقت عبدل پہنچ گیا۔ اسے دفتر میں کچھ آہٹ سنائی دی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا تو حاجی صاحب کی ابتر حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے انہیں سنبھال کر پوچھا۔ کیا ہوا۔ پھر جواب کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ جانتا تھا' کبھی کبھی ان پر دورہ کیوں پڑتا ہے۔ اس نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں میں ابھی آپ کو اسپتال لے چلتا ہوں۔"

وہ انہیں اٹھا کر ایک گاڑی کے پاس آیا۔ پھر اس کا دروازہ کھول کر انہیں پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ حاجی صاحب نے بڑی مشکل سے کہا۔ "وہ بریف کیس.........."

وہ دوڑتا ہوا آفس میں گیا۔ پھر بریف کیس کو اٹھایا۔ وہ مقفل نہیں تھا.......... اٹھاتے ہی کھل گیا۔ یکبارگی بہت سارے نوٹوں کی گڈیاں نگاہوں کے سامنے بکھر گئیں۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اس نے ایک ساتھ اتنی ساری دولت نہیں دیکھی تھی۔ وہ حیران ہو کر کبھی نوٹوں کی گڈیوں کو اور کبھی باہر کھڑی اس گاڑی کو دیکھنے لگا جہاں پچھلی سیٹ پر حاجی صاحب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

دوسرے ہی لمحے اس نے نوٹوں کو سمیٹ کر اس میں رکھنا شروع کیا۔ پھر بریف کیس کو بند کیا پھر اسے اٹھا کر دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس آیا۔ بریف کیس کو اگلی سیٹ پر رکھا۔ اسٹیرنگ سیٹ سنبھالی۔ اسے اسٹارٹ کر کے گیراج سے باہر آیا۔ پھر اس نے گاڑی کو روک دیا۔ وہاں سے اتر کر اس نے شٹر کو بند کیا۔ دونوں شٹر کے تالے لگائے۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسپتال کی طرف جانے لگا۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ "حاجی صاحب! یہ اتنے سارے روپے آپ نے بریف کیس میں رکھے ہیں اور اسے تالا بھی نہیں لگایا ہے۔"

حاجی صاحب نے سنا مگر جواب نہ دے سکے۔ ان کا دل دب رہا تھا۔ سانسیں بھی ڈوب رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہے تھے۔ عبدل نے کئی جگہ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی۔ اپنے پیچھے ایک پولیس سارجنٹ کو لگا لیا۔ سارجنٹ اس کی

گاڑی کے ساتھ چلتا ہوا چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "گاڑی روکو ورنہ بری طرح پیش آؤں گا۔"
عبدل نے کہا۔ "آپ میری جان لے لیں' پھر بھی گاڑی نہیں رکے گی۔ پچھلی سیٹ پر مریض کی حالت بہت خراب ہے۔ پہلے میں انہیں ہسپتال پہنچاؤں گا۔ پھر خود کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

آخر اس نے حاجی صاحب کو اسپتال پہنچا ہی دیا۔ ڈاکٹروں نے ان پر فوری توجہ دی۔ بروقت طبی امداد ملی تو ڈوبنے والے کو کنارا مل گیا۔ جب تک ڈاکٹروں نے یقین نہیں دلایا کہ وہ خطرے سے باہر ہیں' اس وقت تک عبدل ان کے ساتھ لگا رہا۔ جب اطمینان ہو گیا تو وہ اسپتال کے باہر پارکنگ ایریا میں آیا۔ اس نے کار کو لاک کر دیا تھا۔ جب اس کا دروازہ کھولا تو بریف کیس پر نظر گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا اتنے سارے روپے وہ کار میں چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن دانش مندی یہ کی تھی کہ عجلت اور پریشانی کے باوجود اس نے کار کو لاک کر دیا تھا۔ پھر اس نے دوبارہ اسے لاک کیا۔ اسپتال کے انکوائری آفس پر آکر فون کے ذریعے حاجی صاحب کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں ان کی حالت بتائی۔ پھر ریسیور رکھ کر کار میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ حاجی صاحب کی طبیعت سنبھلنے تک بریف کیس کے روپے ان کے صاحبزادوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دل ڈرتا تھا' کہیں وہ پوری رقم دے اور اس پر آدھی رقم دینے کا الزام عائد ہو یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے صاحب زادے نے تمام روپے وصول کرنے کے بعد ان روپوں سے لاعلمی ظاہر کریں اور اس پر چوری کا الزام عائد کر دیں۔ وہ کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ حاجی صاحب کے گھر والوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ گاڑی لے کر چلا گیا۔ سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ ان پانچ برسوں میں اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں صرف اس کی بیوی اور تین بچے تھے۔ اس نے گھر میں پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر کہا۔ "صابرہ! بڑے صندوق کی چابی مجھے دو۔"

اس نے چابی دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہ ہمارے سیٹھ صاحب کی امانت ہے۔ کسی کا ہاتھ لگنا نہیں چاہئے جب تک میں اسے واپس نہ کر دوں' تم بھی یہ صندوق نہ کھولنا۔"

یہ کہہ کر اس نے بریف کیس کو صندوق میں رکھا۔ اسے تالا لگایا اور چابی اپنے پاس رکھ لی۔ شام کو اسپتال گیا لیکن ڈاکٹروں نے مریض سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ ان

کے گھر والے بھی باہر انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ واپس آ گیا۔ رات کو بڑی بے چینی رہی۔ وہ اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ بریف کیس کے روپے آنکھوں کے سامنے یوں اڑ رہے تھے جیسے کسی کی ملکیت نہ ہوں۔ آندھی کے آم ہوں جو چاہے ان آموں کو سمیٹ لے۔ جو سمیٹ لے' اسی کے ہو جائیں۔

رات بھر شیطان بہکاتا رہا لیکن حاجی صاحب کی ایک ہی بات ذہن میں نقش کر رہی تھی۔ رزقِ حلال میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اس کا دماغ ایک پتھر تھا۔ اس پتھر پر جو کندہ کیا جاتا تھا۔ وہی بات نقش رہتی تھی۔ کوئی اسے مٹا نہیں سکتا تھا۔ دوسرے دن وہ اسپتال پہنچا تو حاجی صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک تھی۔ اس وقت ان کے گھر والے نہیں تھے۔ انہوں نے اسے پاس بلا کر بٹھایا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے خیریت پوچھی۔ "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتا دیں؟"

"تم نے جو خدمت کی ہے' میرا اپنا بیٹا بھی نہ کرتا۔ تم نے کیا سوچ کر مجھے اسپتال پہنچا دیا؟"

عبدل نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں بھلا کیا سوچوں گا۔ آپ میرے مالک ہیں۔ میرے محسن ہیں۔ مجھے اچھی باتیں سمجھاتے ہیں۔ میں تو آپ کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ آپ کے لیے دعائیں مانگتا رہا اور تیزی سے گاڑی چلاتا رہا۔ آخر آپ کو یہاں پہنچا کر ہی دم لیا۔"

"میں پوچھ رہا ہوں' تم نے مجھے یہاں کیوں پہنچایا؟ اتنی جلدی کیوں کی؟ ذرا سی دیر کر دیتے تو وہ چالیس ہزار روپے تمہارے ہو جاتے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا ایسی کوئی بات تمہارے دماغ میں نہیں آئی؟ کسی نے تمہیں وہ بریف کیس اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ گیراج کے تمام لڑکے جا چکے تھے۔ میں بالکل تنہا تھا۔ تم ذرا سی دیر کرتے میرا وقت پورا ہو جاتا اور وہ ساری دولت تمہاری ہو جاتی۔"

"حاجی صاحب! آپ میرا امتحان نہ لیں۔ آپ نے مجھے ایک بات سمجھائی ہے کہ رزقِ حلال میں برکت ہے۔ بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

وہ نقاہت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ "میرے بیٹوں نے ان روپوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس رقم کے متعلق انہیں کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"جی ہاں' میں نے سوچا' اگر میں ان کے حوالے کر دوں گا تو ہو سکتا ہے کسی کے دل

میں بے ایمانی پیدا ہو جائے اور میں خواہ مخواہ پھانس لیا جاؤں۔ دیکھیے حاجی صاحب! برا مت مانیے گا' میں آپ کے بیٹوں کو برا نہیں کہہ رہا ہوں۔ ایک عام سی بات کہہ رہا ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں اور تمہیں مشورہ دے رہا ہوں' اس رقم کے متعلق میرے بیوی بچوں سے کچھ نہ کہنا۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ جب میں اسپتال سے واپس آؤں گا تو تم سے اپنی امانت لے لوں گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔ عبدل نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں' مجھے اپنا ماضی یاد آ گیا۔ بہت پہلے کی بات ہے' جب میں بیس برس کا تھا' ان دنوں میں دولت مند نہیں تھا۔ میرے والدین بہت ہی غریب تھے۔"

وہ کہتے کہتے رک گئے۔ ذرا تکلیف کا احساس کرتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ عبدل نے کہا۔ "آپ زیادہ باتیں نہ کریں۔ آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

وہ ہولے سے کراہتے ہوئے بولے۔ "بس اتنا سمجھ لو کہ میں نے ان دنوں پچاس ہزار کا غبن کیا۔"

"کیا؟" عبدل نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں' تم اتنے ایمان دار ہو کہ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ میں تمہیں وہ بات بتا رہا ہوں جو میں نے اپنی اولاد کو بھی نہیں بتائی۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا' اس بے ایمانی کے بعد زندگی میں کبھی کوئی بے ایمانی نہیں کروں گا۔ دوسروں سے نیکی کرتا رہوں گا۔ میں اپنے عہد پر قائم رہا۔ میں پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا رہا۔ میں نے حج کیے۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگتا تھا اور توبہ کرتا تھا۔ یا الٰہی میرے اس ایک گناہ کو معاف کر دے۔ میں اس کے بدلے تیرے بندوں کے ساتھ آخری سانس تک نیکیاں کرتا رہوں گا۔ میں یہی کرتا آ رہا ہوں۔ پتا نہیں میرے غفور الرحیم نے مجھے معاف کیا ہے یا نہیں؟ لیکن جرم آخر جرم ہے۔ اس کا احساس ایک شریف آدمی کو اندر ہی اندر مارے ڈالتا ہے' اور شاید یہی احساس مجھے مار رہا ہے۔"

اسی وقت ایک نرس آئی۔ اس نے حاجی صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی تکلیف بڑھ رہی ہے اور آپ باتیں کر رہے ہیں۔ پلیز' مسٹر! آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

اس نے وارڈ بوائے سے کہا کہ وہ ڈاکٹر کو بلا کر لائے۔ عبدل وہاں سے چلا گیا۔ وہ پچھلی رات کا جاگا ہوا تھا۔ گھر پہنچتے ہی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ صابرہ نے پوچھا۔ "بات کیا ہے' تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو۔ رات کو جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے تمہیں جاگتے ہوئے پایا۔ کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتاؤ۔ آخر بیوی کس وقت کے لیے ہوتی ہے؟"

"کچھ نہیں' ایک امانت ہے وہ میرے سینے پر پہاڑ کی طرح رکھی ہوئی ہے۔"

"کیسی امانت؟"

وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صابرہ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ قریب آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ "اس بریف کیس میں چالیس ہزار روپے ہیں۔"

"چالیس ہزار روپے؟" صابرہ نے اپنی سانس اوپر کی طرف کھینچ لی۔ حیرانی سے شوہر کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں نے سنا ہے' چالیس ہزار بہت ہوتے ہیں۔ اتنے ہوتے ہیں کہ ہم تم گنتی نہیں کر سکتے۔ تمہیں گننا آتا ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "مجھے سو تک گنتی آتی ہے۔ اس کے بعد اندازے سے رقم جوڑ سکتا ہوں مگر چالیس ہزار تک گنتی نہیں آتی۔"

"اور تم اتنے روپے واپس کر دو گے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تقدیر ایک بار مہربان ہوتی ہے' بار بار نہیں ہوتی۔"

"کیا تم مجھے بے ایمانی سکھا رہی ہو؟"

"اس میں بے ایمانی کی کیا بات ہے۔ پیسے ہمارے گھر میں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر بے ایمانی ہے تو ہم ان پیسوں سے جو بھی منافع حاصل کریں گے' اس میں غریبوں کا حصہ رکھیں گے اور نیک کام کریں گے۔ کسی کے دکھ مصیبت میں کام آئیں گے۔ کسی یتیم لڑکی کی شادی کر دیں گے۔ اللہ ہماری نیت دیکھنے والا ہے۔ ہو سکتا ہے' اس نے ہمارے دن پھیرنے کے لیے یہ دولت بھیجی ہو۔ ہم احمقوں کی طرح اسے استعمال نہیں کریں گے تو پھر ساری زندگی ہماری یہی حالت رہے گی۔"

اس نے جھڑک کر کہا۔ "جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے میرا ایمان خراب نہ کرو۔ مجھے نہ بہکاؤ۔ آخر ہو نا عورت۔"

یہ کہہ کر وہ لیٹ تو گیا لیکن آنکھوں سے نیند پھر اڑ گئی صابرہ کی ایک بات دماغ میں

گونج رہی تھی۔ کیا ہوا اگر ہم اس دولت کو استعمال کریں۔ اگر یہ بے ایمانی ہے تو ہم اس کے منافع سے نیکی کریں گے۔ دوسروں کے دکھ درد میں کام آئیں گے۔ کسی یتیم لڑکی کی شادی کریں گے۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔

ساتھ ہی حاجی صاحب کی باتیں بھی یاد آرہی تھیں۔ انہوں نے بھی بے ایمانی کی تھی۔ کسی کی رقم غبن کی تھی۔ اس کے بعد اپنے جرم کو دھونے کے لیے مستقل نیکیاں کرتے چلے آئے تھے۔ معاف کرنا یا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ان کی دنیا سنور گئی تھی۔ وہ دنیا میں نیک نام تھے' پارسا تھے' پرہیزگار تھے' سچے مسلمان تھے' حج کر چکے تھے۔ ان کا نام ہی نام تھا۔ پھر دولت میں کھیلتے رہے تھے۔ یوں بھی ہر شخص اپنا آج دیکھتا ہے' کل نہیں دیکھتا۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ جس کا آج خوب ہوتا ہے۔ اس کا کل خوب تر ہوتا ہے اور خوب تر ہونے کے لیے تھوڑی بہت تو بے ایمانی کرنی پڑتی ہے۔

جب وہ شام کو حاجی صاحب سے ملنے اسپتال کی طرف جانے لگا تو صابرہ نے کہا۔ "آپ جا رہے ہیں لیکن میری بات ضرور یاد رکھیں۔ یہ جتنے دولت مند ہیں' کیا یہ اپنے باپ دادا کے گھر سے دولت لے کر آتے ہیں؟ یا ایمان داری سے اتنی دولت حاصل کرتے ہیں؟ میں کتنوں کے بارے میں سن چکی ہوں' کیا جھوٹ ہے کیا سچ ہے' یہ خدا بہتر جانتا ہے لیکن یہ جو اتنی نیکیاں کرتے ہیں تو اس کے پیچھے یہی بات ہوتی ہے' وہ اپنے گناہ دھوتے رہتے ہیں۔"

وہ اس کی بات آگے نہ سن سکا۔ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ گیراج کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھ کر اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔ گھر سے چلا تو پتا نہیں چلا کہ کیسے وہاں سے چلا تھا؟ اور اسپتال پہنچا تو بھی پتا نہ چلا کہ کیسے پہنچ گیا؟ اس دوران وہ طوفان میں گھرا رہا تھا۔ کن راستوں سے گزرتا رہا' اسے کوئی علم نہیں تھا۔ بس وہ طوفان سے لڑتا رہا تھا۔ اسپتال پہنچتے ہی خبر ملی' حاجی صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ خلا میں تکنے لگا۔ حاجی صاحب کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے جو کچھ کہہ رہے تھے' ان میں سے خاص خاص باتیں دماغ میں نقش تھیں اور وہی کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن ایک بات زیادہ اہم تھی۔ زیادہ دل پر اثر کر رہی تھی۔ وہ یہ کہ حاجی صاحب نے زندگی میں ایک غلطی کی تھی لیکن وہ غلطی ایسی تھی جس کی تلافی وہ بڑی نیک نامی سے کرتے رہے تھے اور دولت مند بنتے رہے تھے۔ ایک غلطی سے کچھ

نہیں ہوتا۔ ایک غلطی خدا بھی معاف کر دیتا ہے اور ایک غلطی دنیا والوں کی نظروں میں نہ آئے تو پھر وہ غلطی نہیں رہتی۔

حاجی صاحب کے گھر والے رو رہے تھے۔ ایک بڑی سی گاڑی میں ان کی میت لے جارہے تھے۔ ان کے بڑے صاحب زادے نے آکر کہا۔ "عبدل! مجھے گیراج کی چابی اور یہ کار دے دو۔ میں کچھ دنوں بعد تم لوگوں سے اس گیراج کا حساب کروں گا۔"

"جب آپ حساب کریں گے تب ہی میں چابی دوں گا۔ بہت سی ذمے داریاں میرے سر پر ہیں۔ میں بغیر حساب کتاب کے چابی نہیں دے سکتا۔"

ان کے صاحب زادے نے اسے گھور کر دیکھا۔ عبدل نے کہا۔ "ناراض ہونے کی بات نہیں ہے۔ میں اصولی بات کہہ رہا ہوں۔ ابھی میں یہ کار لے کر جا رہا ہوں۔ میت میں شریک رہوں گا۔ اس کے بعد آپ میرے ساتھ چلیں۔ گیراج میں پہنچ کر وہاں کام کرنے والوں کے سامنے ایک ایک چیز کا حساب لیں۔ اس کے بعد یہ کار اور گیراج کی چابی آپ کی ہوگی۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے جان بوجھ کر وہ چابی اور گاڑی اس کے حوالے نہیں کی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے صابرہ سے کہا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔ تقدیر مہربان ہو رہی ہے تو ہمیں اس مہربانی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔"

اس نے صندوق کھولا۔ تمام روپے صندوق میں ڈالے پھر خالی بریف کیس کو بند کر کے چابی صابرہ کو دے کر کہا۔ "اسے تالا لگا کر اس کی حفاظت کرتی رہو۔ ہمارے بچوں کو بھی معلوم نہ ہو کہ ہمارے پاس اتنی ساری رقم آگئی ہے۔"

وہ خالی بریف کیس لے کر باہر آیا۔ اسے ڈکی میں رکھا۔ ڈکی کو بند کیا' پھر کار لے کر حاجی صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جب کوئی دولت مند مرتا ہے تو اس کی اولاد اور رشتے داروں کے دل میں کھلبلی سی رہتی ہے۔ جانے مرنے والے نے کیا چھوڑا ہے؟ کوئی وصیت نامہ بھی چھوڑا ہے یا نہیں۔ ان کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں؟ تجہیز و تکفین کے بعد حاجی صاحب کے دو بڑے صاحبزادے عبدل کے ساتھ گیراج میں آئے۔ وہاں کام کرنے والوں کو بھی ساتھ لایا گیا تھا۔ ان کے سامنے ایک ایک چیز کا حساب کیا گیا جب عبدل نے کار کی چابی ان کے حوالے کی تو ایک صاحبزادے نے کار کو کھول کر اندر سے دیکھا۔ اس کے انجن چیک کیے۔ پھر ڈکی کو کھولا۔ اس میں حاجی صاحب کا بریف کیس نظر آیا۔ اس

نے اسے اٹھا کر کھولتے ہوئے پوچھا۔ "یہ یہاں کیسے؟"

عبدل نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم؟ حاجی صاحب نے رکھا ہو گا۔ میں نے تو ڈکی کو کھولا ہی نہیں۔ کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

بریف کیس میں حاجی صاحب کے کچھ ضروری کاغذات برآمد ہوئے۔ ایک صاحبزادے نے کہا۔ "یہ گیراج ایک ہفتے تک بند رہے گا۔ تم سب ایک ہفتے کے بعد آنا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ اب کام کس طریقے سے ہوا کرے گا۔"

عبدل نے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میری تو چھٹی سمجھئے۔ میں اب نہیں آؤں گا مجھے ایک گیراج میں دو ہزار روپے ماہانہ مل رہے ہیں۔"

☆=========☆=========☆

عبدل نے ایک ہفتے کے اندر ناظم آباد میں دو سو گز کا پلاٹ خریدا۔ وہاں رہائش کے لیے مکان بھی بنایا اور گیراج بھی۔ اپنے پانچ برس اور سات برس کے بیٹوں کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ مزدوروں' کسانوں اور روزانہ محدود کمانے والوں اور محدود کھانے والوں کے ہاں اسی لیے بیٹوں کی تمنا کی جاتی ہے کہ بیٹے بچپن ہی سے باپ کے ساتھ کمانے والے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ اگرچہ عبدل اب محدود آمدنی والا نہیں تھا' تاہم اس کی جڑیں غریب طبقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے وہیں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ تعلیم کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ کراچی جیسے شہر میں اچھا کھانے' اچھا پہننے اور اچھی زندگی گزارنے کے لئے ہنر ضروری ہے اور کمانے والے ہاتھ لازمی ہیں۔ اسی لیے وہ بیٹوں کو تعلیم دلانے کے بجائے انہیں اپنا ہنر سکھا رہا تھا۔

دو برس بعد اس کا ایک دوست اس کے پاس دس ہزار روپے قرض مانگنے کے لیے آیا۔ اس نے کہا۔ "بھئی! میں نے اپنی تمام رقم کاروبار میں لگا دی ہے۔ میرے پاس اتنے روپے نہیں ہیں۔"

"کسی طرح بھی مجھے رقم کا انتظام کر کے دو۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ اگر کل صبح تک دس ہزار نہیں دیے تو مجھے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔"

"میں مجبور ہوں۔ ورنہ تمہارے لیے ضرور کچھ کرتا۔"

"میرے پاس سوسائٹی میں ایک ہزار گز کا پلاٹ ہے۔ میں اس کے تمام کاغذات

تمہارے پاس گروی رکھتا ہوں۔ تم یہ کاغذات اپنے پاس رکھ کر مجھے دس ہزار روپے دے دو۔"

عبدل کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "اگر تم نے وقت پر میری رقم ادا نہ کی تو۔"

"تو تم اس زمین کے مالک بن جاؤ گے۔ میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"بھئی تمہارے رشتے دار بعد میں میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ میں نے دس ہزار روپے میں تمہارا سوسائٹی والا ایک ہزار گز کا پلاٹ چھین لیا ہے۔ ایسا کرو میں تمہیں دس ہزار دیتا ہوں' تم پچاس ہزار کا کاغذ لکھ دو اور ساتھ میں یہ لکھ دو کہ اگر ایک مہینے کے اندر تم نے یہ رقم ادا نہیں کی تو تمہارا وہ پلاٹ میرا ہو جائے گا۔"

دونوں میں یہ بات طے پا گئی۔ ایک وکیل کے ذریعے کاغذات تیار ہوئے۔ ان پر دستخط ہوئے۔ عبدل نے کاغذات کو اپنی تحویل میں لیا اور دس ہزار روپے اپنے اس دوست کے حوالے کر دیے۔

اس کے بعد وہ کئی دن تک نظر نہیں آیا۔ وعدے کے مطابق آخری دن آیا لیکن اس کے پاس دس ہزار روپے نہیں تھے۔ اس کی حالت بڑی ابتر تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ بدن کے کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ عبدل نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے اور دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

"میں کیا کروں۔ جاؤ کسی اور کے پاس زمین گروی رکھو۔"

"دیکھو عبدل استاد! تم اپنے آدمی ہو۔ اپنوں سے بے مروتی نہ کرو۔ میں نے اتنی مہنگی زمین تمہارے پاس دس ہزار روپے میں گروی رکھی ہے۔"

"دس ہزار نہیں' پچاس ہزار کہو۔ زبان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جو تحریر میں ہوتا ہے' وہی سچ ہے۔"

"چلو پچاس ہزار سہی لیکن ہم تم جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے بس مجھے دس ہزار اور دے دو۔ میں وہ زمین تمہارے نام لکھ دوں گا۔ اب گروی کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔"

"آخر بات کیا ہے۔ تمہیں اتنی رقم کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "میں نے وہ رقم سٹے پر لگائی تھی۔ سب ہار گیا۔"

"لعنت ہے تم پر جوا کھیلنے کے لیے مجھ سے رقم لے جاتے ہو۔"

"تم سے کیا لے جاتا ہوں۔ اپنی چیز دے کر لے جاتا ہوں اب بھی تم سے کہہ رہا ہوں۔ اتنی مہنگی زمین تمہیں کوڑیوں کے مول مل رہی ہے۔ دس ہزار دے دو اور مجھ سے لکھوالو۔"

"کیا یہ دس ہزار بھی سٹے کے نمبر پر لگاؤ گے۔ تعجب ہے اتنی بڑی رقم داؤ پر لگاتے وقت تمہارا دل نہیں کانپتا۔ تمہیں اپنی بیوی اور معصوم بچوں کا خیال نہیں آتا۔"

"سب آتا ہے مگر دل نہیں کانپتا۔ کیونکہ پورا یقین ہوتا ہے۔ پچھلی بار میں لعل شہباز قلندر کے مزار پر گیا تھا۔ وہاں ایک فقیر سے سامنا ہوا۔ میں نے اس سے گڑگڑا کر نمبر پوچھا۔ اس نے غصے سے کہا۔ "جا' جا' جا۔ جا یہاں سے جا بس میں سمجھ گیا کہ نمبر پانچ آنے والا ہے۔"

"یہ تم کیسے سمجھ گئے؟"

"جو پہنچے ہوئے بزرگ ہوتے ہیں' وہ کبھی سیدھی طرح بات نہیں کرتے۔ کبھی نرمی سے بھی گفتگو نہیں کرتے۔ ہمیشہ دھتکار دیتے ہیں اور انہی کو دھتکارتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جنہیں وہ کچھ دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے پانچ نمبر دیا تھا۔ میں نے وہ پانچ نمبر لگا دیا۔"

"شاباش بہت اچھا کیا۔ اب کس بزرگ نے تمہیں نمبر بتایا ہے۔"

"اس بار کوئی نہیں۔ اس بار تو ایسی بات ہوئی ہے کہ وہ ہونا ہی ہونا ہے۔ اور وہ نمبر ضرور آئے گا۔"

"بھئی کیسے؟"

"پچھلی رات میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ مجھے وہ نمبر نظر آیا تھا۔ ایک بزرگ نے بشارت دی اور انہوں نے تین بار یہ نمبر اپنی زبان سے دہرائے۔"

"دیکھو بھئی خواب اور حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ جو تم نے خواب میں دیکھا' وہی نمبر آئے۔"

"ضروری ہے۔ اگر یہ محض خواب ہوتا تو ایک ہی بار آتا۔ میں نے بزرگ کو جب دیکھا اور وہ نمبر معلوم کیا تو اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ گہری تاریکی میں مجھے وہی نمبر اس طرح لکھے ہوئے نظر

آ رہے تھے' جیسے بلیک بورڈ پر کسی نے ہاتھ سے لکھ دیا ہو۔ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان الجھا رہا۔ پھر سو گیا۔ جب صبح اذان کے وقت میری آنکھ کھلنے والی تھی' اس سے پہلے پھر میں نے بزرگ کو دیکھا۔ وہ وہی نمبر دہرا رہے تھے۔ اب بتاؤ' اگر یہ خواب ہوتا تو ایک بار ہی ہوتا۔ بار بار نہیں ہوتا۔"

عبدل نے کہا۔ "بس میں سمجھ گیا۔ اس بار بھی تم ڈوبنا چاہتے ہو' تمہاری مرضی ہے مگر دیکھو وہ زمین کے کاغذات تو میرے ہو چکے ہیں۔ نہ تم دس ہزار واپس کر سکو گے' نہ وہ کاغذات لے جا سکو گے۔ پھر بھی تم بہت زیادہ پریشان ہو۔ کہیں دوسری جگہ اپنی بیوی کو گروی نہ رکھ دو' یہ سوچ کر میں تمہیں زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔"

"یہ ظلم ہے۔ میں پانچ ہزار میں اپنی زمین تمہارے نام نہیں لکھوں گا۔"

"تمہاری مرضی ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' مجھے دوسرے نقد رقم دینے والے نہیں ملیں گے۔ میں ابھی ان سے دس ہزار روپے لا کر تمہیں دوں گا اور تم سے کاغذات واپس لے جاؤں گا۔"

"تم بھول رہے ہو' میں پچاس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ جو بھی شخص تمہیں پیسے دے گا' اسے پچاس ہزار تو میرے ادا کرنے ہوں گے اور دس ہزار تمہاری ضرورت کے لیے یعنی ساٹھ ہزار میں شاید وہ تم سے سودا نہ کرے اور اگر کرے گا بھی تو میرا کیا ہے' مجھے تو یہاں بیٹھے بیٹھے پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہو جائے گی۔"

وہ بڑی دیر تک عبدل سے بحث کرتا رہا۔ کبھی غصہ دکھاتا رہا' کبھی ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتا رہا۔ آخر وہ سات ہزار پر کاغذ لکھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وکیل کے ذریعے تحریری معاہدہ ہوا۔ کاغذات عبدل کے نام کرائے گئے۔ عبدل نے اسے سات ہزار روپے دے دیے۔

سٹہ کھیلنے والے کا جو بھی حشر ہوا ہو گا وہ تو ظاہر ہی ہو گیا۔ کیونکہ وہ پھر واپس نہیں آسکا۔ عبدل کی چاندی ہو گئی۔ جس علاقے میں وہ پلاٹ تھا' وہاں بڑی تیزی سے ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ بہت سی مارکیٹ وغیرہ بن رہی تھیں۔ عبدل کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ وہاں دو منزلہ عمارت ہی بنا سکتا لیکن دولت آتی ہے تو عقل بھی آجاتی ہے۔ اس نے پہلے دو منزلہ عمارت کا نقشہ بنایا۔ جس کے مطابق نچلا حصہ دکانوں پر مشتمل تھا اور اوپری حصہ فلیٹس پر۔ اس نے ایسے ضرورت مند لوگوں سے ایڈوانس کے طور پر

رقمیں جمع کیں جو اس کی دکانیں کرائے پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس طریقے سے اتنی رقم جمع ہو گئی کہ اپنے پاس سے کچھ رقم ملا کر اس نے نچلے حصے کی دکانیں بنوالیں۔ انہیں کرائے داروں کے حوالے کر دیا۔ پھر ان کرائے داروں سے جو کرایہ آتا رہا' اپنے گیراج سے جو آمدنی ہوتی رہی' انہیں جمع کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اوپر فلیٹ بناتا رہا۔ چھ برس کے عرصے میں وہ دو منزلہ عمارت تیار ہو گئی۔

اس نے واقعی بڑی محنت کی تھی لیکن اس کا نتیجہ یہ ملا کہ اس کے پاس ایک بڑی جائیداد ہو گئی۔ اب بنک میں نقد رقم نہیں تھی۔ چند ہزار روپے پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھا۔ سوسائٹی میں اس کا رکھ رکھاؤ تھا۔ لوگ عزت کرتے تھے۔ جب تک ناظم آباد کے گیراج میں رہا' وہاں وہ عبدل استاد کہلاتا تھا۔ اس کا پیدائشی نام عبداللہ تھا۔ ماں باپ نے عبدل کہنا شروع کیا تو دنیا والے بھی عبدل کہتے تھے۔ بہرحال اب وہ پھر عبداللہ بن گیا۔ سوسائٹی جیسے مہنگے خوب صورت اور اعلیٰ ماحول میں استاد جیسا لفظ کانوں کو ناگوار گزرتا ہے اس لیے وہ استاد کی جگہ ماسٹر کہلانے لگا۔ ماسٹر عبداللہ۔

ماسٹر عبداللہ کی یہ ترقی گھر کے باہر ہی نہ تھی۔ اس نے گھر کے اندر بھی شاندار ترقی کی تھی۔ وہ چھ بیٹوں کا باپ بن گیا تھا۔ اب ساتویں کی آمد تھی' تو یہ بری خبر سننے میں آئی کہ بیٹی ہوئی ہے۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے غصہ اس بات پر نہیں آ رہا تھا کہ چھ بیٹوں کے بعد صابرہ نے بیٹی کیوں پیدا کی۔ بہرحال یہ صابرہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا لیکن اسی میٹرنٹی ہوم میں دس برس پہلے بچے تبدیل ہو گئے تھے اور اسے یقین تھا کہ اس بار بھی اس کا بیٹا ہوا ہے اور اسے بدل دیا گیا ہے۔

ایک شخص جو ہر سال امتحان کی تیاریاں کرتا ہو' ضعیف الاعتقاد ہو اور پاس ہونے کے لیے تعویذ گنڈوں کا سہارا لیتا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ پوری طرح محنت بھی کرتا ہو' جس کے نتیجہ میں ہر سال اول آتا ہو اور ہر سال میٹرنٹی ہوم سے یہ خبر ملتی ہو کہ بیٹا ہوا ہے۔ اگر اس کے برعکس بیٹی کی خبر ملے تو پاس ہونے والا فیل ہونے پر کیسے یقین کر سکتا ہے۔

☆=========☆=========☆

وہ تیزی سے کار ڈرائیو کرتا ہوا میٹرنٹی ہوم کے سامنے پہنچ گیا۔ گاڑی روکی' اسے لاک کیا پھر تیزی سے لپکتا ہوا اندر آیا۔ پہلے تو اس نے اپنے بڑے بیٹے راجو کو تلاش کیا۔

وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ سامنے سے ایک نرس آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "سسٹر! میری وائف کا نام صابرہ ہے۔ وہ کمرہ نمبر دس میں تھی۔ اسے لیبر روم لے جایا گیا ہے۔ آپ بتا سکتی ہیں کیا ہوا؟"

نرس صابرہ کا نام سن کر رک گئی تھی۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "اچھا تو تم اس کے شوہر ہو۔"

"جی ہاں۔"

اس نے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ لوگ بچوں کی فوج بنانا چاہتے ہیں مگر اپنی شریکِ حیات کی صحت اور زندگی کا ایک ذرا خیال نہیں رکھتے۔"

"کیا ہوا۔ کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "جی نہیں' بالکل نہیں۔ آپ باہر جا کر بھنگڑا ڈالیں۔ آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے پلٹ گئی اور لیبر روم کی طرف جانے لگی۔ وہ بیٹے کی خوش خبری سن کر چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گیا۔ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کون سی خبر سچ ہے' جو بیٹے نے سنائی یا جو نرس ابھی کہہ گئی ہے۔ نرس کی بات سچ ہو سکتی ہے کیونکہ وہ لیبر روم میں ہے۔ وہ پلٹ کر لیڈی ڈاکٹر کے دفتری کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس کا بڑا بیٹا راجو اچانک سامنے آ گیا۔ اس نے باپ کو دیکھتے ہی کہا۔ "ابو۔ ہمارا ایک منا بھی آیا ہے۔"

اس نے بیٹے کے گریبان کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ پندرہ برس کا تھا لیکن قد میں اس کے برابر ہو چکا تھا۔ اس نے غصے میں پوچھا۔ "پہلے تم نے غلط اطلاع کیوں دی۔ کیوں تم نے بیٹی کی خبر سنائی۔"

"ابو گریبان تو چھوڑیے' میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ ماسٹر عبداللہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ بیٹا جوان ہے۔ صحت مند ہے اور اس سے پنجہ لڑا سکتا ہے۔ اس کے بیٹے نے کہا۔ "جو خبر مجھے ملی وہ میں نے سنائی۔ پہلے ہمارے بہن پیدا ہوئی' میں نے آپ کو اطلاع دے دی۔ اس کے دس منٹ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا ایک بھائی بھی پیدا ہوا ہے۔ میں نے فون کیا لیکن آپ دفتر میں نہیں تھے۔ خواہ مخواہ یہاں آ کر غصہ دکھا رہے

ہیں۔"

"ابے میرے غصہ دکھانے سے کیا تیری بے عزتی ہو گئی ہے۔"

"ابو یہاں آس پاس بہت سے مرد ہیں' عورتیں ہیں۔ میں اب کوئی بچہ نہیں رہا' کچھ تو خیال کریں۔"

"اچھا اچھا' ٹھیک ہے' کیا تُو سچ کہہ رہا ہے۔ بیٹی بھی ہوئی ہے اور بیٹا بھی ہوا ہے؟"

"آپ لیڈی ڈاکٹر سے جا کر پوچھ لیں تو بہتر ہے۔"

وہ وہاں سے لیڈی ڈاکٹر کے دفتری کمرے کی طرف پہنچا' ڈاکٹر وہاں نہیں تھی۔ لیبر روم میں مصروف تھی۔ وہ کمرے کے باہر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس دوران راجو کبھی نظر آتا تھا' کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ ایک بار اس نے باپ کے پاس آکر کہا۔ "امی نہیں بچیں گی۔ میں لیبر روم کے پاس جاتا ہوں تو عورتیں مجھے بھگا دیتی ہیں۔ مجھے بتاؤ میری ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں اس پر ظلم ہو رہا ہے؟ ایک بار میں نے لیڈی ڈاکٹر کو غصے سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ آپ ظلم کر رہے ہیں۔ آپ میری امی پر ظلم کر رہے ہیں۔ کیوں کر رہے ہیں۔"

وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دبی دبی آواز میں بولا۔ "کیوں بکواس کر رہے ہو۔ یہ اسپتال ہے' لوگ کیا کہیں گے۔ بھلا میں تمہاری ماں پر ظلم کر سکتا ہوں۔ میں تو تمہاری امی کو بہت چاہتا ہوں۔ تم لوگوں کا کتنا خیال رکھتا ہوں۔"

اس نے ناگواری سے اپنے باپ کو دیکھا۔ پھر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نرس نظر آئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے ایک طرف جا رہی تھی۔ اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن پوچھنے کا موقع نہ ملا۔ وہ فوراً ہی سامنے سے گزر گئی۔ پھر ذرا دیر بعد وہ نظر آئی۔ اس وقت وہ ہاتھ میں سرنج لیے اسی لیبر روم کی طرف جا رہی تھی۔ اب ماسٹر عبداللہ کو موقع مل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ "سسٹر! آخر کیا بات ہے۔ کیا پریشانی ہے؟"

وہ غصے سے بولی۔ "کیا پریشانی ہو گی۔ تمہارے ہاں تیسرا بچہ ہوا ہے۔ تم لوگ کیسے مرد ہو۔ کیا عورت کو انسان نہیں سمجھتے ہو۔ واہ' یہ بھی خوب رہی۔ پہلے ایک بیٹی' پھر ایک بیٹا۔ اس کے بعد پھر ایک بیٹا۔ اونہہ۔"

وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر لیبر روم کی طرف چلی گئی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا خلا میں تکتا رہا۔ اپنی اولاد کی گنتی کرتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ صرف چھ بیٹوں کا باپ تھا اب دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بن گیا تھا۔ آٹھ بیٹوں میں اگر ایک بیٹی ہو تو کوئی بات نہیں' برداشت کی جا سکتی ہے۔ وہ خوشی سے کھل گیا۔ واپس لیڈی ڈاکٹر کے کمرے کی طرف گیا۔ خیال آیا' ابھی تو لیڈی ڈاکٹر مصروف ہو گی۔ پھر وہ میٹرنٹی ہوم سے باہر آیا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ اسے کسی طرح قرار نہیں آرہا تھا۔ صابرہ نے تو کمال کر دیا تھا۔ ایک کے بجائے تین تین۔ وہ اس وقت کا منتظر تھا کہ اسے صابرہ کے پاس جانے کا موقع ملے۔ وہ اسے مبارک باد دے اور اسے بڑے سے بڑا انعام دینے کا وعدہ کرے۔ پھر اپنے دو بیٹوں کو دیکھے۔ بیٹی کو بھی دیکھ ہی لے گا۔

وہ پھر میٹرنٹی ہوم کے اندر آیا۔ اس وقت ایک اسٹریچر پر صابرہ کو اس کے کمرے میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس نے ذرا دور سے دیکھا' وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ بالکل زرد تھا۔ اس کی ناک اور منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ ایک نرس آکسیجن سلنڈر کو تھامے ٹرالی کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ دور کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ صابرہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اسے اس کے کمرے میں پہنچایا جا رہا تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ کمرے میں جا کر اسے دیکھ سکے۔ جانتا تھا کہ نرسیں اس سے اتنی ناراض ہیں تو لیڈی ڈاکٹر کتنی ناراض ہو گی مگر یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگر صابرہ کی یہ حالت ہوئی ہے تو اس نے اسے اس حال کو نہیں پہنچایا ہے۔ زچگی کے بعد عورت کی کچھ یہی حالت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ تین بار ایسے مرحلے سے گزر چکی تھی۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے صرف ایک اور بیٹے کی فرمائش کی تھی۔ اب قدرت کو یہ منظور تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے اُسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو وہ گھور کر اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ "تشریف رکھیے۔"

وہ اس کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ آپ ہر سال دو سال میں اپنی بیگم کو لے کر یہاں آیا ہی کرتے ہیں۔"

"وہ خیریت سے تو ہے؟"

"جی نہیں' اگر وہ بچ جائے تو یہ ایک معجزہ ہو گا۔ ویسے ہم ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں' آپ کے بچے کتنے ہیں؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "ابھی میں نے سنا ہے تین ہوئے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو میں نو بچوں کا باپ ہوں۔"

"ان بچوں کے علاوہ ضائع کتنے ہوئے۔"

"پانچ۔"

"کل تعداد کتنی ہوئی؟"

"چودہ۔"

"کیا آپ عالمی ریکارڈ توڑنا چاہتے ہیں؟"

"ڈاکٹر! آپ کا اندازِ گفتگو مناسب نہیں ہے۔"

"کیا آپ بہت ہی مناسب انداز میں ازدواجی زندگی گزار رہے۔ آپ کی بیوی اگر آج مرجائے تو اس کے قاتل ہونے میں آپ فخر محسوس کریں گے۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اگر حالات میری بیوی کو اس مرحلے پر لے آئے ہیں۔ اگر میں ایک بچے کی تمنا کروں اور وہ تین بچوں کی وجہ سے اس حال کو پہنچ جائے تو میرا کیا قصور ہے۔"

"آج آپ یہ عذر دے کر اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں لیکن جب آپ کے ہاں چوتھے بچے کی ولادت ہوئی تھی' اسی وقت میں نے سمجھا دیا تھا کہ آپ کی وائف اس قابل نہیں ہے کہ مزید بچے پیدا کر سکے۔ آپ احتیاط کریں۔ زیادہ بچے ضروری نہیں ہیں۔"

"کیوں ضروری نہیں ہیں۔ کیا ہم ہونے والے بچوں کو قتل کر دیں۔"

"آپ لوگوں کی یہی سوچ ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ کیا آپ لوگوں کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ اپنے وطن پاکستان سے دشمنی کر رہے ہیں۔"

اس نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک کے اس حصے کی آبادی تین کروڑ بیس لاکھ تھی۔ اب یہ نو کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ یعنی ہم نے پاکستان کی ابتدا سے آج تک پانچ کروڑ اسی لاکھ افراد کا اضافہ کیا ہے۔"

"آپ ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں ہی ان پانچ کروڑ اسی لاکھ افراد کے اضافے کا ذمہ

دار ہوں۔"

"آپ اگر نہیں ہیں تو کیا ہوا آپ جیسی سوچ رکھنے والے اس کے ذمے دار ہیں۔ آپ اپنے لباس سے' ظاہری شخصیت سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ رکھنے والے نظر آتے ہیں۔ کیا آپ اپنے ملک کی اقتصادیات' معاشیات اور اس کے پس منظر میں بڑھتی ہوئی آبادی کے متعلق کچھ اسٹڈی نہیں کرتے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہمارے ہاں بچوں کی پیدائش کی یہی شرح رہی تو سولہ برس کے اندر ہماری آبادی پندرہ کروڑ سے زیادہ ہو جائے گی۔ ہمارے دیہاتوں اور ہمارے شہروں میں اتنی جگہ نہیں رہے گی کہ ایک آدمی آرام سے پاؤں پھیلا کر لیٹ سکے۔ زمین تنگ ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں اتنی خوراک نہیں ہوتی' نہ ہی اتنا کپڑا ہوتا ہے۔ کیا آپ لوگ اپنی آئندہ نسل کو ننگے بھوکے رکھنے اور ان کے منہ سے گالیاں سننے کے لیے پیدا کر رہے ہیں۔"

"ڈاکٹر! اگر آپ کی اتنی لمبی چوڑی تقریر کا مقصد یہ ہے کہ میں بچوں کی پیدائش روک دوں تو بخدا یہ میرے بس میں نہیں ہے اور جو خدا کے بس میں ہے اس میں' میں مداخلت نہیں کر سکتا میں مسلمان ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ یہ اللہ کی دین ہے۔ وہ دیتا ہے تو وہی رزق کا بندوبست بھی کرتا ہے۔ آپ میرے سامنے اقتصادیات اور معاشیات کا فلسفہ پیش نہ کریں۔"

لیڈی ڈاکٹر تھوڑی دیر تک اسے بے بسی سے گھورتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھا' اتنا بتا دیجئے' کیا آپ کو اپنی بیوی سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے؟"

"آپ ہمدردی کی بات کرتی ہیں' میں اس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔"

"کیا یہی محبت ہے کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے اور تم اولاد کی تمنا کیے جاتے ہو۔ صابرہ بیگم کی پوری فائل میرے سامنے ہے۔ مجھے معلوم ہے اس کی شادی چھوٹی عمر میں ہوئی تھی۔ ہمارے ملک میں چھوٹی عمر میں شادی' اور جلد جلد بچوں کی پیدائش کے باعث سالانہ چھبیس ہزار مائیں مرجاتی ہیں۔ یہ کوئی معمولی تعداد نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ ان ماؤں کے مجازی خداؤں کو ذرا بھی ان پر ترس نہیں آتا۔"

ماسٹر عبداللہ نے آہستگی سے کہا۔ "آج جو صابرہ کی حالت ہے' مجھے اس پر افسوس ہے۔"

"عبداللہ صاحب! صابرہ کی حالت آج ہی نہیں' اس سے پہلے بھی خراب ہوتی رہی

ہے۔ جب بھی یہاں ڈلیوری کے لیے آئی' اس کی حالت خراب ہوتی رہی ہے۔ ہم اس پر خصوصی توجہ دیتے رہے۔ آج تو انتہا ہو گئی ہے۔ اگر یہ کیس بگڑ گیا۔ اگر وہ جانبر نہ ہو سکی تو ہمارے میٹرنٹی ہوم کی بدنامی ہو گی اور وہ بے چاری جان سے جائے گی۔ آپ کا کیا بگڑے گا۔ آپ شاید چالیس دن تک بھی اس کا سوگ نہ منائیں۔ دوسری شادی کر لیں۔"

ماسٹر عبداللہ چپ رہا۔ سوچنے لگا' کہاں آکر پھنس گیا۔ اس وقت لیڈی ڈاکٹر غصے میں ہے۔ یقیناً اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک مریضہ کی جان بچانے کے لیے یہ جتنی پریشانیاں اٹھا رہی ہے' اس کے پیش نظر جتنا بھی غصہ دکھائے' کم ہے۔

اس نے سوچتے سوچتے ذرا پیچھے سر گھما کر دیکھا تو کمرے کے دروازے پر راجو کھڑا ہوا اسے گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر نفرت کا الاؤ ابل رہا ہے اور وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو باپ نہیں سمجھ رہا ہے۔ صرف ماں کے رشتے سے مجبور ہے اس لیے محض گھورنے پر اکتفا کر رہا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر تو غصہ دکھا رہی تھی۔ اپنے سامنے کا چھوکرا بھی گھورنے لگا تو ماسٹر عبداللہ کو غصہ آگیا۔ وہ ایک دم سے جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "اے تم بھی مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ کیا مجھے کچا چبا جاؤ گے۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ جسے دیکھو' بس مجھے دشمن سمجھ رہا ہے۔ ارے اگر میں دشمن ہوں تو اتنے برسوں سے وہ عورت میرے ساتھ کیسے زندگی گزار رہی ہے۔ جا کر محلے' پڑوس والوں سے پوچھو۔ اس علاقے میں سب سے اچھا کھاتی ہے۔ سب سے اچھا پہنتی ہے۔ گاڑیوں میں گھومتی ہے۔ اس کے پاس کبھی پیسے کی کمی نہیں ہوتی۔ جو ضرورت ہوتی ہے وہ میں پوری کرتا ہوں۔ پھر مجھے کیوں الزام دیا جا رہا ہے۔ اگر وہ مر رہی ہے تو کیا ہم میں سے کوئی کسی کو مار سکتا ہے۔ موت تو وہی دیتا ہے۔ جو زندگی دیتا ہے۔ تم سب صرف زمین پر ہی نہیں' چاند میں پہنچ کر' ستاروں میں پہنچ کر خاندانی منصوبہ بندی کرو' زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہو گی اور اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ تمہاری خاندانی منصوبہ بندی سے کچھ نہیں ہو گا۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ کار میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا' یہ سچ ہے صابرہ پر ظلم ہو رہا ہے مگر میں کیا کروں؟ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ دوسری شادی کر لوں۔ صابرہ کے اب نو بچے ہو چکے ہیں۔ وہ ان میں مصروف رہے گی۔ ان کی پرورش کرتی رہے گی۔ اسے میری کمی محسوس نہیں ہو گی۔ یوں

بھی میں اس کے پاس آتا جاتا رہوں گا۔ اس کی ضروریات پوری کرتا رہوں گا۔ اس کے دکھ سکھ میں کام آتا رہوں گا مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ آج اس حال کو پہنچ گئی ہے۔ واقعی مجھے اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی ہو گا۔"

اس سے پہلے بھی کئی بار اس کے دل میں دوسری شادی کا خیال آیا۔ کسی نئی عورت کی محبت میں گرفتار ہونے کا خیال کچھ ایسا دلچسپ اور دل نشیں ہوتا ہے کہ گھنٹوں اس تصور میں آدمی مگن رہتا ہے لیکن وہ اب تک اپنے کاروبار میں مصروف رہا تھا' اپنی سوسائٹی والی جائیداد بنانے کی فکر میں تھا۔ اب وہ دکانیں اور فلیٹس مکمل ہو گئے تھے۔ آمدنی شروع ہو گئی تھی۔ گیراج کا کام بھی خوب چل رہا تھا۔ کاروں کی خرید و فروخت بھی جاری تھی۔ اب وہ اطمینان سے دوسری شادی کے سلسلے میں کسی عورت کا انتخاب کر سکتا تھا۔

☆=========☆=========☆

اس نے دفتر کے سامنے گاڑی روک دی۔ گیراج میں لڑکے کام کر رہے تھے۔ دفتر میں کچھ لوگ بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ایک گاڑی کا سودا کرنے آئے تھے۔ ماسٹر عبداللہ تھوڑی دیر کے لیے دوسری بیوی کے متعلق سوچنا بھول گیا۔ کاروباری معاملات کے دوران وہ گھریلو باتیں یا تفریحات کے متعلق سوچنا بالکل نامناسب سمجھتا تھا۔ صرف کاروبار سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے کئی بار اس پہلو سے بھی غور کیا کہ دوسری شادی مہنگی پڑے گی۔ اخراجات بڑھیں گے۔ دونوں طرف سے اولادیں ہوں گی۔ اس کی موت کے بعد جائیداد کا جھگڑا کھڑا ہو گا' اور یہ تو اس کے بعد کی باتیں تھیں۔ زندگی میں اسے خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ کاروبار پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے آج تک دوسری شادی سے پرہیز کیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا لیکن لگتا نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے جب کسی عورت نے اس میں دلچسپی ظاہر کی تھی لیکن وہ اب تک کتراتا آیا تھا۔ اتنا جانتا تھا کہ اس قسم کی عورتیں ایک بار انگلی پکڑ لیں تو پھر شہ رگ تک پہنچ جائیں گی۔

دوسرے دن صابرہ کی حالت سنبھل گئی۔ راجو گھر میں بچوں کو سنبھالتا تھا یا پھر اسپتال میں ماں کے پاس رہتا تھا۔ ایک ہفتے بعد صابرہ اسپتال سے گھر آگئی۔ اس دن راجو نے اپنے باپ سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ باپ نے پوچھا۔ "تم کہاں سے فون کر

رہے ہو۔ گیراج آ کر کام کیوں نہیں کرتے۔ یہاں تمہارے بغیر بہت سا کام پڑا ہوا ہے۔"

"میں ابھی نہیں آؤں گا۔ پہلے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم یہاں آ کر بھی باتیں کر سکتے ہو؟"

"ابو بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ باپ اپنے بیٹے کے اور بیٹا اپنے باپ کے روبرو نہیں کہہ سکتا۔"

"کیسی باتیں' کیا تم کوئی پہیلی بجھوا رہے ہو؟"

"نہیں میں ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں' الفاظ کہاں سے لاؤں۔"

"راجو! جو لوگ صاف اور سیدھے انداز میں بولنے کا حوصلہ نہیں رکھتے وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں میں الجھ جاتے ہیں۔ جو کہنا ہے۔ صاف صاف کہہ دو۔"

"تو پھر سنئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ ہمارے ہاں کوئی منا یا منی آئے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"میں نے کہنے کا حوصلہ کیا ہے۔ آپ سننے اور سمجھنے کا حوصلہ کریں۔ ابو! خدا گواہ ہے' میں نے امی کے سرہانے راتیں جاگ جاگ کر گزاری ہیں۔ میں کیسی کیسی ذہنی پریشانیوں سے دوچار ہوتا رہا ہوں' میں کیا سوچتا رہا ہوں' کیا کرنا چاہتا تھا' میں باغی ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی دل چاہتا تھا کہ میں آپ کو........ آپ کو........"

"ہاں' ہاں کہو۔ رک کیوں گئے۔ کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔"

"اس سوال کا جواب آپ خود دے سکتے ہیں۔ اگر کوئی میری ماں کو قتل کرے تو کیا میں اس کے قاتل کو چھوڑ سکتا ہوں۔ خواہ وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔"

"یو نان سینس۔ تم میرے بیٹے ہو۔ میرا خون ہو۔ تم میرے متعلق ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔"

"ابو غصہ دکھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے مجھے کہنے کا حوصلہ دیا ہے تو سننے کا حوصلہ بھی کیجئے۔ میں نے صرف سوچا ہے' عمل نہیں کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں مرغی بھی ذبح نہیں کر سکتا' تو پھر میں آپ کو کیسے قتل کر سکتا ہوں لیکن دماغ میں ایسی باتیں ضرور آتی ہیں۔ ایک شخص جو چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتا' وہ تصور میں ہاتھی کو مارتا ہے۔ میری باتیں آپ مجھ تک محدود رہنے دیں۔ آپ یہ سوچیں کہ میرے دماغ میں آپ

کے خلاف ایسی بات کیوں پیدا ہوئی اور اگر ہوئی ہے تو آپ میرے دماغ سے ایسی باتوں کو مٹانے کے لیے مجھے ذہنی طور پر پُرسکون رکھنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔"

"کیا کر سکتا ہوں؟"

"بہت کچھ سوچنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ مجھے میری امی کے تحفظ اور سلامتی کا یقین دلائیں دیکھئے' ہمارا گھر اسی طرح شاد اور آباد رہے گا۔ آپ ہم سے ہفتوں دور رہتے ہیں۔ ہم آپ سے کبھی شکایت نہیں کرتے لیکن یہ جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں ہمارے لیے کرتے ہیں۔ ہمیں آپ پر فخر ہے۔ کیا آپ میری ایک بات مان کر مجھے میری ماں کی سلامتی کا یقین نہیں دلا سکتے۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ پھر تم سے بات کروں گا۔ تم کل سے کام پر آجاؤ۔"

وہ ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔ شام کو جلد ہی اپنا دفتر اور گیراج بند کرنے کے بعد وہ فلیٹ میں نہیں گیا بلکہ کار میں بیٹھ کر ناظم آباد والے فلیٹ میں صابرہ سے ملنے پہنچ گیا۔ صابرہ اور بچے اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ چونکہ ایک ہی دن تین بچوں کی ولادت ہوئی تھی۔ اس لیے کچھ قریبی رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے تاکہ تین بچوں کو سنبھال سکیں اور صابرہ کی تیمارداری کر سکیں۔ رات کو کھانے کے بعد جب اسے صابرہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا تو اس نے کہا۔ "جانتی ہو تمہارے راجو نے آج مجھ سے فون پر کیا گفتگو کی ہے؟"

"کیا کوئی خاص بات کہہ رہا تھا؟"

"ہاں۔ وہ کہتا ہے اب ہمارے ہاں کوئی بچہ نہیں ہونا چاہیے۔"

صابرہ نے شدید حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا راجو نے ایسا کہا؟"

"ایسا تو نہیں کہا لیکن سلیقے سے کہا۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو اپنے باپ کے باپ بن جاتے ہیں اور باپ بن کر یہ حکم صادر کرتے ہیں کہ ہمیں کتنی اولاد پیدا کرنی چاہیے اور کہاں پہنچ کر کنٹرول کرنا چاہیے۔"

"آپ برا نہ مانیں۔ وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔ میرے لیے بہت پریشان رہتا ہے۔ اس نے جیسی خدمت کی ہے' اگر کوئی بیٹی ہوتی تو وہ بھی ایسا نہ کرتی۔ وہ میرے لیے دعائیں مانگتا رہا ہے۔ اگر اس نے نادانی میں ایسا کہہ دیا ہے تو آپ برا نہ مانیں۔"

"مجھے برا ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ میں وہی کروں گا جو ہمارا جوان بیٹا چاہتا ہے۔ آج سے میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

وہ گھبرا کر بولی۔ "نہیں نہیں' خدا کے لیے آپ ایسی بات زبان پر نہ لائیں۔ ایک نادان بچے کے کہنے کا برا نہ مانیں۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ وہ آئندہ ایسی باتیں نہیں کرے گا۔ آپ سے معافی بھی مانگے گا۔"

"دیکھو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تعلق نہ رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تم میری بیوی ہو۔ میرے اتنے سارے بچوں کی ماں ہو۔ میں تمہارا اسی طرح خیال رکھوں گا۔ تمہارے ہر دکھ سکھ میں کام آتا رہوں گا۔ لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ مجھے ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں دوسری شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ اٹھ کر جانا چاہتا تھا صابرہ نے اس کے قمیض کے دامن کو پکڑ لیا۔ پھر کہا۔

"رک جایئے۔ آپ اپنا فیصلہ سنا کر اس طرح نہیں جا سکتے۔ میں نے تو کوئی فیصلہ نہیں سنایا۔ جو کچھ کہا میرے بیٹے نے کہا اور وہ نادان ہے۔ وہ ناتجربہ کار ہے ہماری آپ کی ازدواجی زندگی کے معاملات کو ہم سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اگر اسے ذرا بھی عقل ہوتی تو وہ آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔ کرنے سے پہلے سمجھ لیتا کہ آپ مجھ پر سوکن لا سکتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتا۔ جب گاڑی کا دوسرا پہیہ کام نہ آئے تو پہیہ بدل دیا جاتا ہے۔ نیا پہیہ لگا دیا جاتا ہے۔ پرانا پہیہ ایک جگہ پڑا رہ جاتا ہے اور اس کی مثال کچھ درست نہیں ہے کیونکہ پہیہ تو پھر بھی مرمت کے بعد چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ عورت اگر اپنے مرد کی نظروں سے ایک بار گر جائے' ایک بار اس کے خیال میں ناکارہ ثابت ہو جائے تو پھر اس کی جگہ آنے والی نئی عورت اسے کسی کام کا نہیں رہنے دیتی۔ میں وعدہ کرتی ہوں' قسم کھاتی ہوں' تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔ میں بھی مانتی ہوں کہ جب اللہ دیتا ہے تو بندے کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہمارے نصیب میں اور زیادہ اولادیں لکھی ہیں تو ہم ان اولادوں کو قبول کریں گے۔ ان سے انکار نہیں کریں گے۔"

ماسٹر عبداللہ نے اپنے قمیض کے دامن کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کہہ رہی ہو۔ جب اولاد جوان ہو جاتی ہے اور اپنے ہاں مزید اولاد کی پیدائش کے سلسلے میں سرگوشیاں کرتی ہے۔ تو والدین کو جھجک محسوس ہوتی ہے۔ کچھ شرم آتی ہے۔ یہاں تو سرگوشی کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا بیٹا تو بڑے تم تڑاق سے دعویٰ کر رہا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہوگا تو وہ تصور ہی تصور میں مجھے قتل کرتا رہے گا۔"

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ راجو آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گا۔ مجھے ایک موقع دیجئے۔ میں اس طرح سمجھاؤں گی کہ کبھی وہ آپ سے آنکھیں ملا کر بات بھی نہیں کرے گا؟"

"اچھی بات ہے۔ تم سمجھاؤ۔ تمہارا بیٹا سمجھے۔ اگر آئندہ وہ مجھے چیلنج کرے گا تو مجھے چیلنج کا جواب دینا آتا ہے۔"

وہ چلا گیا۔ صابرہ راجو کو بلانا چاہتی تھی پھر خیال آیا اس کا بیٹا دن کو کام کرتا ہے اور رات کو پڑھنے جاتا ہے۔ بہت محنتی ہے۔ اسے اپنے مستقبل کا بہت خیال رہتا ہے۔ مستقبل میں وہ کوئی بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ اس کے عزائم بلند ہیں' اور جیسے اچھے عزائم ہیں' ویسا ہی محبت بھرا دل وہ رکھتا ہے۔ اپنی ماں کو وہ بہت ہی چاہتا ہے۔

صابرہ اپنے بیٹے کے تصور میں کھو گئی۔ اس کا چہرہ ممتا سے تمتمانے لگا۔ پھر اپنے شوہر کا خیال آیا۔ بڑھتی ہوئی اولادوں کے متعلق سوچنے لگی۔ کیا کرے' مجبوری ہے۔ عورت یہ تو نہیں چاہتی کہ ہر بار قیامت کے عذاب سے گزرے۔ تخلیق کا کرب برداشت کرے اور بچوں پر بچے پیدا کرتی چلی جائے لیکن مجبور ہے۔ مرد چاہتے ہیں تو عورت کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ ایک بار اس محلے میں خاندانی منصوبہ بندی کے ادارے سے سمجھانے کے لیے دو عورتیں آئی تھیں۔ انہوں نے محلے کی عورتوں سے فرداً فرداً باتیں کیں۔ انہیں سمجھایا۔ "صرف مردوں کا قصور نہیں ہوتا۔ اس میں عورتوں کی رضامندی بھی شامل ہوتی ہے۔"

ایک عورت نے کہا۔ "ہم راضی کیسے نہیں ہوں گی نہ ہوں گی تو پٹائی ہوتی ہے اور اگر مرد گالیاں دینے اور مارنے والا نہ ہو تو وہ دوسری جگہ بہل جاتا ہے۔ آخر اسے روکنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

ایک عورت نے جواب دیا۔ "سارا قصور مردوں کا نہیں ہوتا۔ ہم عورتیں بھی ایک دوسرے سے مقابلتاً یہ سوچتی رہتی ہیں کہ اس کے ہاں تین بچے ہوئے ہیں تو میرے ہاں دو کیوں رہیں۔ میں بھی تین بچوں کی ماں بن سکتی ہوں۔"

ایک اور عورت نے کہا۔ "صاف بات تو یہ ہے کہ ہمیں دنیا داری کا بھی خیال رکھنا

پڑتا ہے۔ محلے کی عورتیں جب آپس میں بیٹھتی ہیں تو طرح طرح کی باتیں بناتی ہیں۔ کوئی کسی عورت کے خلاف بولتی ہے۔ کوئی کسی عورت کے خلاف۔ اگر ایک عورت دو برس' چار برس تک ماں نہ بنے تو اس پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ طرح طرح سے طعنے دیے جاتے ہیں۔ بانجھ ہونے کی گالی دی جاتی ہے۔"

ایک عورت نے کہا۔ "کسی کے ہاں صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ آئندہ شاید کوئی بیٹا پیدا ہو۔ اسی امید پر وہ بچے پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی کے ہاں بیٹے ہی بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں ایک بیٹی کا ارمان ہوتا ہے۔ اسی طرح بچوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے' ہمارے ہاں جو آبادی بڑھ رہی ہے تو اس کی ایک وجہ نہیں ہے۔ کئی وجوہات ہیں۔"

آنے والی ایک خاتون نے پوچھا۔ "بھئی' اس محلے کی تمام عورتوں میں جو ایک وجہ مشترک ہو۔ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی وہی بتاؤ۔"

ایک معمر عورت نے کہا۔ "بیٹی! بس ایک ہی بات ہمارے درمیان مشترک ہے۔ ہم سب یہ سوچتی ہیں کہ مرد ہمارے ہاتھ میں رہے اگر ہاتھ سے نکلا تو پھر گھر میں دوسری آجائے گی۔"

صابرہ سہمی ہوئی تھی۔ تصور میں اس کی سوکن اس کے گھر میں چلی آرہی تھی اور اسے گھر سے باہر دھکے دے کر نکالا جا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے خیالات سے چونک گئی۔ معلوم ہوا' راجو نائٹ اسکول سے آگیا ہے۔ اس نے اسے اپنے پاس بلایا۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ بیٹا آئے گا تو اس سے سخت لہجے میں بات کرے گی لیکن اس کی صورت دیکھتے ہی ممتا پگھل گئی ہے۔ بیٹے نے سر جھکا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے' امی؟"

"یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔"

وہ پاس آکر بیٹھ گیا۔ "کیا تم نے اپنے باپ سے کچھ کہا تھا؟"

اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "میں نے کیا کہا تھا۔"

"انجان نہ بنو۔ تم نے ایسی بات کہی ہے جو نہیں کہنا چاہیے۔ یہ تمہارے ماں باپ کا معاملہ ہے۔ ہم بہتر جانتے ہیں کہ ہمیں کس طرح زندگی گزارنا چاہیے۔"

"معاف کیجیے امی! اگر بہتر جانتے تو اولاد کو بولنا نہ پڑتا۔ میں آپ کے ساتھ اسپتال میں رہا ہوں۔ میں نے آپ کی ایک ایک ڈوبتی ہوئی سانس کا حساب کیا ہے۔ آپ کو موت

سے لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جب آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں تو میں سرہانے ملک الموت کو نہیں دیکھتا تھا بلکہ ابو کو ہاتھ میں ننگی تلوار لیے دیکھتا تھا۔ وہ آپ کی بوٹی بوٹی کاٹتے رہتے تھے اور میں اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر انہیں روکنے کی کوشش کرتا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ خلا میں بھٹک رہے ہوں اور میں بہت کمزور ہوں۔ ابو کے مقابلے میں بہت کمزور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بس بغاوت کر سکتا ہوں۔ امی جب میں انہیں ابو کہنا چاہتا ہوں تو میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ دل کہتا ہے جو میری ماں کا دشمن ہے میں اسے اپنا باپ کیسے کہوں۔"

"نہیں بیٹے! نہیں' ایسا نہیں کہتے وہ تمہارے ابو ہیں۔ وہ میرے دشمن نہیں ہیں۔"

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ کیا میں نے ڈاکٹر کی باتیں نہیں سنی ہیں۔"

"بیٹے! ڈاکٹر اپنی جگہ درست کہتی ہے لیکن کسی کے درست کہنے سے ہمارا گھر ہنستا بستا گھر بگڑ سکتا ہے تو وہ درست بات بھی ہمارے لیے درست نہیں ہو سکتی۔"

"امی! آپ کے بگڑ جانے سے یہ سارا گھر بگڑ جائے گا۔ ابو کیا چیز ہیں۔ وہ تو مہمان کی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' آپ ہی کو ماں کے روپ میں بھی دیکھا ہے اور باپ کے روپ میں بھی۔ آپ ہیں تو یہ گھر ہے' آپ نہیں ہیں تو یہ گھر آباد نہیں رہے گا۔ آپ اتنا تو سوچیے کہ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کے بعد ہمارا کیا ہو گا۔"

"بیٹے! میں سب سمجھتی ہوں۔ عورت ایسے وقت دوراہے پر ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کے لیے بھی سوچتی ہے اور شوہر کے لیے زیادہ سوچنا پڑتا ہے۔ اگر نہ سوچے تو بچوں پر سوتیلی ماں آجاتی ہے۔"

"اچھا تو ابو نے آپ کو یہ دھمکی دی ہے۔"

"دھمکی کی بات نہیں ہے' بیٹے وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ انہیں کون روک سکتا ہے۔"

"میں روک تو نہیں سکتا لیکن آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔ وہ ایک نہیں دس شادیاں کر لیں تو آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ اب آپ کو ان سے کیا لینا ہے۔ ہمارے اتنے بہن بھائی ہیں۔ اتنا اچھا گھر ہے۔ وہ ہماری ضروریات پوری کریں گے۔ نہیں کریں گے تو میں جوان ہو چکا

ہوں۔ میں کماؤں گا۔ میں آپ سب کو کھلاؤں گا۔"

"بیٹے! یہ ناتجربہ کاری کی باتیں ہیں۔ ابھی تمہیں کچھ بننے کے لیے' اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے بہت کچھ پڑھنا ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے۔ تم ہنر بھی سیکھ رہے ہو' علم بھی حاصل کر رہے ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ تم اپنے کام سے لگے رہو۔ ہمارے معاملات میں نہ پڑو۔"

"یہ کیسی بات ہے امی! بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی انہیں ماں باپ کے معاملات میں شریک نہیں کیا جاتا۔ انہیں ناسمجھ سمجھا جاتا ہے۔"

"جوان ہونا اور بات ہے۔ دنیا کا تجربہ کرنا اور بات ہے۔ تم ناتجربہ کار ہو' اس لیے نادانی کر رہے ہو۔"

"امی! جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں' ان میں' میں نہیں آپ لوگ نادانی کر رہے ہیں۔ آپ مجھے جھٹلا سکتی ہیں لیکن لیڈی ڈاکٹر کو نادان نہیں کہہ سکتیں۔"

"کچھ بھی ہو' تم بحث نہ کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر آپ بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں برداشت کی حد تک آپ کو عذاب میں مبتلا دیکھوں گا۔ جب نہیں دیکھ سکوں گا تو آپ سے پہلے جان دے دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کوئی بات سنے بغیر وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔ ماں آوازیں دیتی رہی مگر وہ واپس نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد صابرہ کی بھاوج نے آکر کہا۔ "راجو کھانا نہیں کھا رہا ہے۔ کپڑے بدل کر کہیں جا رہا ہے۔"

صابرہ نے کہا۔ "اس سے کہو' جانے سے پہلے مجھ سے دو باتیں کر لے۔ اگر وہ نہیں آئے گا تو میں بیماری کی حالت میں اٹھ کر اس کے پاس آجاؤں گی۔"

اس کی بھاوج چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد راجو کمرے میں آیا۔ پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔ دل گھبرا رہا ہے۔ ذرا ہوا خوری کے لیے جا رہا ہوں۔"

"تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"بھوک بعض اوقات نہیں لگتی۔ کیوں نہیں لگتی' اتنا تو آپ جانتی ہوں گی۔"

"دیکھو بیٹے! حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھو۔ تمہارے آگے بہت لمبی زندگی پڑی

ہے۔"

"یہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ ہمارے آگے بہت لمبی زندگی ہے۔ اگر آپ کا ساتھ نہیں رہے گا تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ آپ ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ اس بات کو آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔"

"میں سمجھتی ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"بس ایک فیصلہ کر لیجئے۔ آپ بتا دیجئے کہ آپ اس عمر میں شوہر کے لیے جینا چاہتی ہیں یا اپنے بچوں کے لیے؟"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ راجو نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے۔ ابو آپ کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن آپ ہمارے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ابو آپ سے دور رہیں تو کیا فرق پڑے گا۔"

"بیٹے! میں تم لوگوں کی بھلائی کے لیے تمہارے ابو کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ انہیں اپنے ساتھ رکھنا اور سوکن کا راستہ روکنا بہت ضروری ہے۔ وہ آئے گی تو اس سے اولاد ہو گی۔ پھر وہ تمہارے حقوق میں حصے دار بنے گی۔ تمہارے باپ نے جو کچھ کمایا ہے' جو جائیداد ہے' اس میں اپنا حصہ لے گی۔"

"میں دولت اور جائیداد پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میری سب سے بڑی دولت آپ ہیں۔ اگر سوکن آتی ہے' اگر ہمارے سوتیلے بہن بھائی ہوتے ہیں تو ہونے دیجئے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف آپ کی فکر ہے۔ آپ اپنا فیصلہ سنا دیجئے۔"

وہ اضطراب میں مبتلا ہو گئی۔ پریشانی سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ پھر بے بسی سے بولی۔

"بیٹے! دوسری عورت آئے گی تو بڑے جھگڑے ہوں گے' بڑے مسئلے پیدا ہوں گے۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ وہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔ اس کے لیے کوئی دوسرا گھر ہو گا۔ ابو یہاں پہلے بھی نہیں آتے تھے' بعد میں بھی نہیں آئیں گے۔ کبھی کبھی مہمانوں کی طرح آجایا کریں گے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ دیکھئے میں ایک کاغذ لے کر آتا ہوں اس میں آپ کی طرف سے ایک اجازت نامہ لکھتا ہوں۔ اس اجازت نامے کی رو سے ابو دوسری شادی کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ آپ کے اور ہم سب بہن بھائیوں کے حقوق تمام عمر ادا کرتے رہیں۔"

"نہیں بیٹے! ایسی جلدی نہ کرو۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔"

"اچھی بات ہے، آپ سوچئے صبح تک فیصلہ کیجئے۔ اگر فیصلہ کرنے میں دشواری ہو تو میرے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلئے۔ میں جن صاحب کے پاس ٹیوشن پڑھتا ہوں، وہ بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ بزرگ ہیں۔ بہت اچھی اچھی اور تجربے کی باتیں بتاتے ہیں۔ آپ ان سے بھی مشورہ لیجئے۔ اگر میری بات غلط ہو تو میں سر جھکا لوں گا اور جو آپ کہیں گی، اس پر راضی رہوں گا ورنہ جو میں کہہ رہا ہوں، آپ وہی کریں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ صابرہ سر جھکا کر سوچتی رہی۔ ایک طرف اولاد تھی، دوسری طرف شوہر۔ عورت زندگی کے کتنے ہی مرحلوں میں ایسے ہی دوراہے پر کھڑی رہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کدھر جائے۔ بچوں کو دیکھے یا شوہر کو۔ اس کے ایک طرف شوہر ہوتا ہے اور دوسری طرف بچے۔ بیچ میں وہ دریا کی طرح بہتی رہتی ہے۔ کبھی اس ساحل پر زیادہ چھلکتی ہے، کبھی اس ساحل پر زیادہ چھلک جاتی ہے۔

☆======☆======☆

اس دوران صابرہ اور اس کے تین نوزائیدہ بچوں کی تصاویر مختلف اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں۔ محلے کی عورتیں تو خیر صبح و شام آیا ہی کرتی تھیں، دور دراز کے علاقوں سے بھی کتنی ہی عورتیں وہاں آکر حیرانی سے تین بچوں کو دیکھتی تھیں۔ ان کی ماں کو دیکھتی تھیں اور صابرہ سے طرح طرح کے سوالات کرتی تھیں۔ مرد بھی آتے تھے جنہیں ٹال دیا جاتا تھا لیکن کچھ ایسے ہوتے تھے جنہیں ٹالنا مناسب نہ ہوتا۔ مثلاً وہ اخباری رپورٹر ہوتے یا مختلف رسالوں میں مضامین اور ایسے موضوعات پر کہانیاں لکھنے والے قلم کار ہوتے یا پھر خاندانی منصوبہ بندی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے تھے۔ ایسے لوگوں کو ماسٹر عبداللہ کے دفتر کا پتہ بتا دیا جاتا تھا۔

ماسٹر عبداللہ اب نئی شادی کی فکر میں تھا۔ پہلے اس نے رشتے داروں میں دور دور تک نظر ڈالی، کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ پھر وہ دوستوں سے اپنی شادی کے سلسلے میں ذکر کرنے لگا۔ ایک شادی کے دفتر والا اس کا شناسا تھا۔ اس نے کہا میں تمہیں بہت سی تصویریں دکھاؤں گا۔ کتنی ہی شریف زادیوں کے پتے بتاؤں گا۔ ان کے والدین سے مل کر تم معاملات طے کر سکتے ہو۔

وہ اپنی ہونے والی دوسری بیوی کے تصورات میں گم رہتا تھا۔ ایسے ہی وقت اخباری رپورٹرز اور خاندانی منصوبہ بندی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے اسے گھیرنے لگے۔

طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ پہلے تو وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ صحیح جواب نہیں دے پاتا تھا۔ سب یہی پوچھتے تھے، جب پہلے سے چھ بیٹے موجود تھے تو مزید اولاد کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی، اس کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ وہ بچوں کی پیدائش کو روکنا گناہ سمجھتا ہے۔ یہ پیدا ہونے والے بچوں کا قتل ہے اور وہ قاتل بننا نہیں چاہتا۔"

ایک نوجوان منچلے رپورٹر نے سوال کیا۔ "بھائی صاحب! کیا آپ کے پاس کوئی ایسا کامیاب نسخہ ہے کہ صرف بیٹے ہی بیٹے پیدا کیے جا سکیں؟"

ماسٹر عبداللہ نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے خاندان میں صرف بیٹے ہی بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بار میری بیوی نے غلطی سے بیٹی پیدا کی جس کی تلافی کرتے ہوئے اس نے دو بیٹے بھی پیدا کر دیے۔"

"کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ کے ہاں بیٹے پیدا ہوں گے؟"

"مجھے یقین ہوتا ہے تب ہی میں فخر کرتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ دنیا، سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنی ترقی کر رہی ہے، کیا یہ ایسا نسخہ ایجاد نہیں کر سکتی کہ اس دنیا میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو۔" وہ کم پڑھا لکھا کم فہم آدمی تھا۔ اخباری رپورٹروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کی باتوں کا جواب الٹے سیدھے انداز میں دے سکتا تھا۔

"آپ کو اندیشہ کیوں ہے کہ مردوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے؟"

"ابھی حال ہی میں، میں نے ایک اخبار میں آبادی اور وسائل کے سلسلے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ حالیہ مردم شماری کے تحت اس میں یہ بات لکھی ہوئی تھی کہ ۱۹۲۱ء میں ایک ہزار عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد زیادہ ایک ہزار دو سو تئیس تھی لیکن ۱۹۸۱ء میں یہ تعداد گھٹ کر ایک ہزار ایک سو دس رہ گئی۔ اب آپ اندازہ کریں کہ ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۸۱ء تک مردوں کی تعداد کتنی کم ہو گئی ہے۔ اب عورتوں کے مقابلے میں ایک سو تیرہ مرد زیادہ پیدا ہو رہے ہیں، تو یہ بھی مختلف امراض اور حادثات کا شکار ہو کر جانے کتنی تعداد میں مرجاتے ہوں گے۔ اگر ستر، اسی مرد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ رہ جاتے ہیں تو یہ تعداد کچھ بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں مجھے اور میرے خاندان کو فخر ہے کہ ہم مرد بچے پیدا کرتے ہیں۔" اخباری نمائندے زور زور سے ہنسنے لگے۔ ماسٹر عبداللہ سمجھا کہ اس نے کوئی بہت اچھی بات کہہ دی ہے۔

"مگر کیسے؟ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ کسی ایک خاندان کو صرف بیٹے ہی بیٹے پیدا

کرنے کا اعزاز حاصل ہو جائے۔"

"ہاں' ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم عورتوں کو اپنی دھونس میں رکھتے ہیں۔ اپنے غصے کے ذریعے دن رات اپنی مردانگی کی دھاک بٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ ہم سے دہشت زدہ رہتی ہیں۔ ہمارا ہی خوف ان کے دل و دماغ پر رہتا ہے اور وہ سوچتی ہیں کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہو گا تو وہ بھی کہیں کی نہیں رہیں گی۔ شاید اسی وجہ سے وہ ہماری مرضی کے مطابق لڑکے پیدا کرتی ہیں۔"

"آپ کی بعض باتیں ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسلیم ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھیں گے' آئندہ کیا ہوتا ہے۔"

"آئندہ میں دوسری شادی کرنے والا ہوں۔"

"اچھا' کب؟"

"جب بھی کوئی اچھا سا رشتہ مل جائے۔"

اخباری رپورٹروں اور خاندانی منصوبہ بندی کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں نے متفقہ طور پر اپنا فیصلہ سنایا کہ آپ کے خاندانی حالات معلوم کرنے کے بعد شاید ہی آپ کو کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ دے۔

وہ ناراض ہو کر بولا۔ "کیوں' میرے خاندانی حالات کیسے ہیں۔ کیا خراب ہیں؟"

"آپ کے اپنے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں کی عورتیں گھٹے ہوئے ماحول میں دہشت زدہ رہتی ہیں اور کوئی بھی سمجھ دار شخص آپ کے ہاں رشتہ کرنے سے ہمیشہ احتراز کرے گا۔"

ماسٹر عبداللہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک میں اتنی غربت اور بدحالی ہے۔ صرف کراچی شہر میں ہزاروں لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے غریب والدین صرف چند بوتلوں کے عوض نکاح پڑھا کر انہیں رخصت کر دیتے ہیں۔ ان سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ خاندان کیا ہے اور جس لڑکے کے ساتھ بیاہ رہے ہیں' اس کا مزاج کیا ہے۔ غریب کی بیٹی اس کے سر کا بوجھ ہوتی ہے جس کو وہ جلد سے جلد سر سے اتار پھینکنا چاہتا ہے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ غریب لڑکیوں کے رشتے بہت ملتے ہیں لیکن غریبوں کے ہاں تعلیم نہیں ہوتی اور ماسٹر عبداللہ اس بار ایک تعلیم یافتہ شریکِ حیات چاہتا تھا لیکن ایسی جو

بہت زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہ ہو' بس ایسی ہو کہ اس کے ساتھ کاروں میں گھومتی پھرتی رہے۔ جس تقریب میں جائے' اس میں نمایاں رہے لیکن مزاج ایسا ہو کہ شوہر کے خلاف کبھی نہ جائے۔ جو وہ کہے' وہی کرے۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں اللہ میاں کی گائے نہیں ہوتیں۔ ایسی گائے ہوتی ہیں جو کبھی کبھی سینگ بھی مار دیتی ہے۔ اس لیے ایسی کسی لڑکی کا رشتہ ملنے میں دیر لگ رہی تھی۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر رشتہ کرنا چاہتا تھا۔

شادی کے دفتر کے ایجنٹ نے جو پہلے پراپرٹی ایجنٹ تھا۔ اسے سمجھایا۔ "بھائی عبداللہ ہمارا معاشرہ ایسا نہیں ہے کہ تم شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی سے چند مرتبہ ملو' اس کے مزاج کو سمجھو' پھر اس کے بعد شادی کے لیے ہاں کرو۔ دراصل مشرقی طرز کے گھرانے ہی اس بات کی ضمانت ہیں کہ اس ماحول میں پرورش پانے والی لڑکیاں سگھڑ ہوتی ہیں۔ سلیقہ شعار ہوتی ہیں گھریلو ازدواجی زندگی گزارنے کے سلسلے میں اپنے شوہر سے سمجھوتہ کرنا بھی جانتی ہیں۔ لہٰذا جس لڑکی سے میں تمہارا رشتہ طے کرانا چاہتا ہوں' اس کے لیے ہاں کر دو۔ اس کے والدین نہایت شریف ہیں لیکن غریب ہیں۔ لڑکی کو نہ تو جہیز میں کچھ دے سکیں گے اور نہ لڑکی کے لیے تم سے کچھ مطالبہ کریں گے۔ بس یہی ہے کہ ساری زندگی تم اس کے ساتھ نباہ کرو گے۔ اس کے کھانے' پہننے کپڑے آرام و آسائش کا خیال رکھو گے۔ جو نکاح میں ہوتا ہے وہی ہو گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مہر کی رقم زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے ہو گی۔"

ماسٹر عبداللہ نے سوچا' پھر تو ٹھیک ہی ہے۔ اگر اپنے مزاج کے مطابق نہ نکلی تو دس ہزار روپے کسی وقت بھی اس کے منہ پر مار کر اسے طلاق دی جا سکتی ہے' اور طلاق کے سو بہانے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے ہاں کرنے کے ایک ہفتے کے اندر ہی شادی ہو گئی۔ لڑکی والے بھی جلدی کر رہے تھے۔ کیونکہ لڑکی کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ ایک ایسے شخص کو جس کے نو بچے ہوں' اسے کوئی پندرہ سولہ برس کی لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ جو بھی ملی اسے دیکھ کر ماسٹر عبداللہ خوش ہو گیا۔ وہ اس کی توقع کے مطابق تھی۔ سہاگ رات کو اس کا گھونگھٹ الٹ کر اس نے کہا۔ "دیکھو تمہارا نام زیب النساء ہے اور میں بہت ماڈرن آدمی ہوں۔ بڑے بڑے لوگوں میں میرا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ یہ تمہارا نام بہت ہی اولڈ سٹائل کا ہے۔ میں تمہیں زیبی کہا کروں گا اور تم میری سوسائٹی میں زیبی عبداللہ کہلاؤ گی او کے۔"

زیبی کو توقع تھی کہ گھونگھٹ الٹنے کے بعد اس کا شوہر اس سے محبت بھری گفتگو کرے گا جیسا کہ وہ فلموں میں دیکھتی آئی تھی' کہانیوں میں پڑھتی آئی تھی' سہیلیوں سے سنتی آئی تھی۔ اس کے برعکس عبداللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے پلنگ کے پاس ہی ٹہلتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں پہلی رات اپنے متعلق تفصیل سے بتا دینا چاہتا ہوں تاکہ تم میرے مزاج کو سمجھ لو۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ میرے آٹھ بیٹے ہیں۔ میری بیوی نے ایک بیٹی پیدا کی۔ میں نے اسے سزا دی۔ اسے چھوڑ کر تم سے شادی کی ہے۔ یہ غلطی تم نہ دہرانا۔ ورنہ اس قسم کی سزا تمہیں بھی ملے گی۔"

وہ بے چاری سر جھکائے سن رہی تھی۔ پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسا شخص ہے جو پہلی رات حاکمانہ انداز میں مستقبل کا لائحہ عمل پیش کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "زیبی' اگر عورت سمجھ دار ہو۔ وہ مرد کی ایک بات مان کر اپنی دس باتیں منوا سکتی ہے۔ میرے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ تم میرے بیٹے کی خواہش پوری کر کے میری دولت سے سب کچھ حاصل کر سکتی ہو۔ جو چاہو کھا سکتی ہو' جو چاہو پہن سکتی ہو۔ جہاں چاہو گھومنے پھرنے جا سکتی ہو لیکن میرے ساتھ۔ میں عورت کو زیادہ آزادی دینا پسند نہیں کرتا۔"

وہ ٹہلتا ہوا ایک تصویر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس تصویر میں ایک باز اپنے شکار پر جھپٹ رہا تھا۔ اس نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری دو باتیں یاد رکھو اور ان پر عمل کرو۔ اس کے بعد تم میرے گھر پر بھی اور میرے دل پر بھی حکومت کرو گی۔ پہلی بات وہی کہ میں صرف بیٹا چاہتا ہوں۔ دوسری بات کا تعلق ہمارے عقیدے سے ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی زندگیاں آنی ہیں وہ آئیں گی۔ انہیں ہم خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے نہیں روک سکتے۔ روکنا چاہیں تو یہ سراسر کفر ہے۔ جو اللہ کی دین سے انکار کرتا ہے' اس کے گھر سے برکتیں اٹھ جاتی ہیں۔" اب زیب النساء کی وہ ساری حیا غائب ہو چکی تھی جو پہلی رات کی دلہن کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے تک رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ یہ محض ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل اور آئندہ نسل کی تباہ کاریوں کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کا تعلق مذہب سے نہیں' ایمان سے نہیں ہے۔ ایمان تو یہ ہے کہ دس بچوں کو جاہل' گنوار' بیمار' کمزور اور نہایت کمتر بنانے کے بجائے کم سے کم دو یا زیادہ سے زیادہ چار بچے ہوں۔ انہیں اچھا

صحت مند' تعلیم یافتہ اور قابلِ فخر بنائیں۔ ایمانداری یہی ہے کہ یہ دنیا ہمارے ہاتھوں خوب تر ہو۔ بدتر نہ ہو۔"

لیکن زیبی کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ شوہر کی جگہ ایک درندے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ دوسرے دن وہ میکے گئی تو نہایت ہی قیمتی کپڑے اور زیورات پہنے ہوئے تھی۔ مگر چہرہ زرد تھا۔ چہرے کی کتاب آخر کتنے لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ محلے کی' پڑوس کی عورتیں اس کے زیورات اور اس کے لباس کو دیکھ کر رشک کر رہی تھیں۔ تعریفیں کر رہی تھیں کہ بڑے گھر میں بیاہی گئی ہے۔ نصیبے والی ہے۔

بعض عورتوں کو زیورات' کار' کوٹھیاں اور بینک بیلنس بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ تقریباً ایک ماہ بعد زیبی کی ملاقات اپنی ایک بے تکلف سہیلی سے ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "سناؤ تمہارے میاں کیسے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "بس ٹھیک ہیں۔"

"بس ٹھیک ہیں کا کیا مطلب ہوا۔ بھئی تم تو بڑی شاندار زندگی گزار رہی ہو۔"

"ہاں دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔ یوں تو میں بہت چمکیلی بھڑکیلی نظر آتی ہوں۔ بہت خوش ہوں لیکن پریشان بھی ہوں۔"

"بھئی مجھ سے تو کچھ نہ چھپاؤ مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے شاید میں تمہیں کوئی مناسب مشورہ دے سکوں۔"

"میرے میاں اصولوں کے ایسے پکے ہیں کہ ان کو کسی کا مشورہ پسند نہیں آئے گا۔"

"پھر بھی کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"کیا بتاؤں۔ ان کی حرکتیں ایسی ہیں کہ دنیا والوں کے سامنے زبان پر نہیں لا سکتی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رات کو اچانک میری آنکھ کھلتی ہے تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پھر میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کا ہاتھ میری گردن پر ہے۔ میں پریشان ہو کر کہتی ہوں' ہاتھ ہٹائیے' وہ نیند میں بڑبڑاتے ہیں۔ پہلے بولو بیٹا ہو گا۔ جب میں کہتی ہوں' ہاں بیٹا ہو گا' تو وہ ہاتھ ہٹا لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گہری نیند سو جاتے ہیں مگر میری نیند اڑ جاتی ہے۔ دماغ میں بس وہی ایک بات گونجتی ہے۔ بیٹا' بیٹا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں کتنے

ہی مردانہ چہرے نظر آتے ہیں۔ ان سب چہروں پر میرے میاں کا چہرہ حاوی ہوتا ہے۔"

سہیلی نے پوچھا۔ "کیا تمہارے میاں ماہرِ نفسیات ہیں جو اس طرح تم پر نفسیاتی اثر ڈال رہے ہیں۔"

"خاک ماہرِ نفسیات ہیں' اپنے خاندانی نسخے آزما رہے ہیں۔ شادی سے پہلے بتایا تھا کہ بڑے تعلیم یافتہ ہیں۔ بعد میں پتا چلا' میٹرک پاس بھی نہیں ہیں۔ صرف اردو پڑھنا جانتے ہیں۔ انگریزی کسی حد تک سمجھ لیتے ہیں۔"

"چلو' کوئی بات نہیں۔ تمہیں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے۔ ہر طرح سے خوش ہو۔ شوہر میں سر سے پاؤں تک خوبیاں ہی خوبیاں نہیں ہوتیں۔ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان خامیوں کو یا تو قبول کرنا پڑتا ہے۔ یا رفتہ رفتہ انہیں دور کرنا پڑتا ہے' کوشش کرو کہ وہ تمہارے مزاج کے مطابق ڈھل جائیں۔"

"یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔ تم نے انہیں دیکھا نہیں ہے۔ ان کے تیور عجیب ہیں۔ روز صبح اخبار پڑھتے رہتے ہیں اور میں جب ان کے پاس سے گزرتی ہوں تو پوچھتے ہیں۔ "کیا خبر ہے؟"

سہیلی نے حیرانی سے پوچھا۔ "ارے اخبار خود پڑھتے ہیں اور خبر تم سے پوچھتے ہیں۔" پھر وہ چونک کر بولی۔ "اوہ اچھا سمجھ گئی لیکن انہیں خبر نہیں خوشخبری پوچھنا چاہیے۔"

"جی نہیں ان کے لیے خوش خبری اس وقت ہوگی۔ جب بیٹا ہوگا ورنہ محض خبر ہوگی۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ اس کی سہیلی نے حیرانی سے پوچھا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" مگر وہ ہنستی رہی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ گدگدی ہو تو ہنسی آئے یا کوئی لطیفہ سن کر ہی قہقہے لگائے جائیں۔ بعض اوقات رونے کی بات پر بھی ہنسنا آتا ہے اور بے اختیار آتا ہے۔ وہ اپنے میاں کو ایک اچھی خبر سنانا چاہتی تھی لیکن وہ خوش خبری سننا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اچھی خبر بھی نہیں سنا رہی تھی اور چونکہ نہیں سنا رہی تھی اس لیے اندر ہی' اندر پک رہی تھی۔ عورت چاہتی ہے کہ ایسے وقت وہ فخر سے اپنے شوہر کے سامنے یہ بات کہے لیکن کیسے کہے جس مرد کے اشتراک سے وہ اپنی ممتا پر فخر کرنا چاہتی تھی' اسی مرد کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

اس کی ہسٹریائی ہنسی بے اختیار تھی اور بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ اس کی ماں اور رشتے کی عورتیں بھی کمرے میں آگئیں۔ سب نے اسے جھنجھوڑا۔ ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ سہیلی نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔ پھر ان کی پوچھ گچھ کے دوران وہ ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گئی۔

ماسٹر عبداللہ شام کو جب اسے میکے سے لینے آیا تو پتا چلا وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "ڈاکٹر نے کیا بتایا؟"

"کچھ نہیں۔ کہہ رہے تھے کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس یونہی غشی طاری ہو گئی تھی۔"

"یونہی تو کوئی بات نہیں ہوتی۔"

"وہ ماں بننے والی ہے۔"

اس نے چونک کر اپنی ساس کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے' کسی بڑے ڈاکٹر سے معائنہ کرانا چاہیے۔ میں نے تو آج تک نہیں سنا کہ ماں بننے والی عورت پر غشی طاری ہوتی ہے۔"

"بیٹا! یہاں ناظم آباد کا جو مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹر ہے وہی یہاں آیا ہے۔ اسی نے زیبی کا معائنہ کیا ہے۔"

"ناظم آباد میں کیسے ڈاکٹر ہوتے ہیں' میں جانتا ہوں۔ اچھے تجربہ کار اور مہنگے ڈاکٹر سوسائٹی میں ہوتے ہیں۔ میں کسی بہت بڑے ڈاکٹر سے اس کا علاج کراؤں گا۔"

وہ زیبی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ سوسائٹی کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا۔ اس نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ کی وائف صحت مند ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر! یہ بے ہوشی کیوں طاری ہو گئی۔ سنا تھا کہ ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"جب طبی معائنے کے بعد اچھی طرح تشخیص کے باوجود کوئی بیماری سمجھ میں نہ آئے تو مریض کی ذہنی کیفیت مشکوک ہوتی ہے۔ آپ کسی ماہرِ نفسیات ماہرِ دماغ سے رجوع کریں۔"

اس نے کسی ماہرِ نفسیات کے پاس جانا ضروری نہیں سمجھا۔ شاید وہ خود کو سب سے

بڑا ماہر نفسیات سمجھتا تھا۔ پچھلے تجربات شاہد تھے کہ اس نے جو سوچا' نتیجہ اس کی مرضی کے مطابق سامنے آیا۔ اس رات وہ دیر تک جاگتا رہا اور دیر تک زیبی کو اپنے بیٹوں کے متعلق بتاتا رہا۔ اس کے البم میں آٹھ بیٹوں کی تصویریں تھیں۔ اس نے کہا۔ میں ان تصویروں کو بڑے سائز میں پرنٹ کراؤں گا' اور یہاں بیڈروم میں رکھواؤں گا۔ تاکہ صبح و شام میرے بیٹوں کو دیکھتی رہو۔

وہ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن واقعی اس نے اپنے بیٹوں کی بڑے بڑے سائز کی تصویریں پرنٹ کروانے کے بعد اپنے کمرے میں لگوائیں۔ صرف یہی نہیں تیسرے دن سے اس کے آٹھ بیٹے صبح پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کے ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔ زیبی کے آس پاس بیٹھ جاتے تھے۔ اسے اپنے سوتیلے بیٹوں سے نفرت نہیں تھی۔ اس لیے کبھی سوکن نے اس کا سامنا نہیں کیا تھا اور کبھی پیٹھ پیچھے برائی نہیں کی تھی۔ بچے بھی وہاں نہیں آتے تھے۔ باپ کے مجبور کرنے سے آنے لگے تھے۔ اصل میں اس کے لیے اپنے شوہر کا رویہ ہی ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

ایک رات وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ جب آپ یہ مانتے ہیں کہ اولاد اللہ کی دین ہے۔ اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے تو اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہو گا' وہی ہمارے گھر آئے گا۔ خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔"

"بکواس مت کرو۔ بیٹی کا لفظ زبان پر مت لاؤ اور نہ ہی کبھی تصور میں کسی بیٹی کا چہرہ دیکھو۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہیے اور میں ہمیشہ کامیاب رہا ہوں۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ایک جیسی کامیابی ہو۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر اس کے ہاتھ اس کے چہرے پر سے پھسلتے ہوئے کانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے گردن کی طرف گئے۔ پھر اس نے اس کے گھنے بالوں کو مٹھی میں سختی سے جکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے کہا۔ "تمہاری زلفیں بہت لمبی اور گھنی ہیں۔ میں ان زلفوں کو چھت سے باندھ کر تمہیں لٹکا دوں گا۔ پھر چاقو لے کر ایک قصائی کی طرح تمہاری کھال اتار دوں گا۔ میں جب کہتا ہوں کہ بیٹی کا نام نہ لو تو اس سلسلے میں' میں کوئی بحث سننا نہیں چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے زیبی کو دھکا دیا۔ وہ بستر پر جا کر گر پڑی۔ پھر تلملا کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ کیا میں کوئی جاہل عورت ہوں۔ کیا یہ آپ کو زیب دیتا ہے۔ آپ اونچی اور اچھی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا یہی سوسائٹی کے آداب ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ میری مرضی کے خلاف بحث کرو گی تو میں سوسائٹی کے آداب کا اور میاں بیوی کے تعلقات کا لحاظ نہیں کروں گا۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں تمہیں سونے کا نوالہ کھلاتا ہوں۔ تم اور جو چاہو گی تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔ اس معاملے میں' میں جو چاہتا ہوں' وہی ہونا چاہیے۔"

وہ بیڈروم سے باہر چلا گیا۔ زیبی اندر ہی اندر غصے سے کھولتی رہی۔ کئی بار دماغ میں آیا کہ میکے چلی جائے مگر وہاں جا کر کیا کرے گی۔ ماں باپ غریب ہیں۔ شریف گھرانے کی لڑکیاں اپنے شوہر کا گھر نہیں چھوڑتیں اور وہ کیا کرے کہاں جائے۔ اگر بزرگوں نے پوچھا۔ شکایت کیا ہے تو شکایت کیا کرے گی۔ کس زبان سے کہے کہ شوہر اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ کس طرح ایک بیٹے کا مطالبہ کرتا ہے اور خلافِ فطرت باتیں کرتا ہے۔

خاندان کے بزرگ زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ ماسٹر عبداللہ کو سمجھائیں گے۔ شاید وہ بزرگوں کے سامنے سر جھکا لے لیکن ایک شوہر تنہائی میں بیوی کے ساتھ جیسا سلوک کرتا ہے' وہ اس کی تفصیل دوسروں کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے کسی حد تک سہیلی کو بتا دیا تھا لیکن ہر ایک کے سامنے زبان کھولنا لڑکیوں کے بس میں نہیں ہوتا اور اگر بس میں ہوتا بھی ہے تو حجاب آڑے آتا ہے۔

اس نے خوب سوچ سمجھ کر پھر اپنی اس بے تکلف سہیلی کو بلایا۔ اس نے کہا۔ "تم کسی حد تک میرے شوہر کے دماغ میں یہ بات ٹھونسنا شروع کر دو کہ ان کے ہاں بیٹی ہو گی۔ میں ان کی یہ سوچ بدلنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں خواہ مخواہ مخالفت مول لے رہی ہو' یا تو ان کو چھوڑ دو یا پھر ان کی مرضی کے مطابق چلو۔"

"نہیں' مجھے بھی ضد ہو گئی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ بیٹا ہی پیدا ہو تا کہ میرا گھر نہ ٹوٹے لیکن میں انتقاماً ان کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنا چاہتی ہوں۔ تم اپنے میاں سے مل کر کوئی ایسا رویہ اختیار کرو کہ یہ حضرت عورتوں پر رعب جمانا بھول

جائیں۔"

"اچھا' میں کوشش کروں گی۔" اس کی سہیلی نے وعدہ کیا۔ پھر دوسرے دن ہی اس نے ٹیلی فون کے ذریعے ماسٹر عبداللہ سے رابطہ قائم کیا۔ ماسٹر عبداللہ نے پوچھا۔ "ہیلو آپ کون ہیں؟"

"میں ایک بیٹی ہوں اور بہت جلد آپ کے گھر آنے ہی والی ہوں۔ آپ یہ مانتے ہیں کہ بیٹیاں شریف گھرانے میں پیدا ہوتی ہیں۔"

"آپ کیا باتیں کر رہی ہیں۔ کس سے کر رہی ہیں۔ اس موضوع کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ آخر آپ کون ہیں؟"

"میں نے کہانا' میں ایک بیٹی ہوں اور اس دنیا میں بیٹی کو پیدا ہونے کا حق ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"میں آپ کو پہلے سے اطلاع دے رہی ہوں۔ آپ کی بیٹی ہوں اور آپ کے گھر میں پیدا ہونے والی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ماسٹر عبداللہ نے حیرانی سے اپنے ریسیور کو دیکھا۔ پھر ہیلو' ہیلو کہہ کر آواز دی۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اونہہ کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہونا چاہا۔ ذرا دیر بعد ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا ہے۔ فون پر جو باتیں ہوئی تھیں' وہ اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا' کون ہو سکتی ہے' کس عورت نے اسے فون کیا ہے' آخر ایسی باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے' کیا مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ میرے گھر میں بیٹا نہیں بیٹی پیدا ہو گی۔ آخر کون سمجھانا چاہے گا؟

اس سوال کا جواب اس کے دماغ میں یہی آیا' وہی لوگ سمجھائیں گے جنہیں زیبی کی فکر ہو گی کہ کہیں بیٹی پیدا کرنے پر اس کا شوہر اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ اسے اپنی نظروں سے گرا نہ دے۔ لٰہذا یا تو ایسا زیبی نے کیا ہے یا زیبی کے میکے والوں نے۔

اس نے غصے سے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ اس چھت کے اوپر وہی فلیٹ تھا جہاں وہ زیبی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ تیزی سے چلتا ہوا' سیڑھیاں پھلانگتا ہوا فلیٹ میں آیا۔ زیبی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "یہ کیا دھاندلی ہے۔ تم اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتی ہو۔"

زیبی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟"

"ابھی مجھے فون کس نے کیا تھا؟"

"میں کیا جانوں۔ ٹیلی فون آپ کو کتنے ہی لوگ کرتے رہتے ہیں' اور میں آپ کے ٹیلی فون سنتی تو نہیں۔"

"لوگ نہیں' کسی عورت نے فون پر بات کی تھی اور میرے مزاج کے بالکل خلاف بات کی تھی۔"

"تو آپ اس کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہے ہیں۔"

"وہ ضرور تمہارے میکے کی کوئی عورت ہو گی۔"

"تعجب ہے۔ آپ بات نہیں بتا رہے ہیں اور الزام دے رہے ہیں۔"

وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔ "وہ بکواس کر رہی تھی کہ وہ میری بیٹی ہے اور میرے گھر میں پیدا ہونے والی ہے۔"

بے اختیار زیبی زیر لب مسکرانے لگی۔ اس نے کہا۔ "اگر کوئی عورت آپ کی بیٹی بننا چاہتی ہے تو یہ کوئی بری بات نہ ہوئی آپ اسے بیٹی کہہ لیتے۔ کیا فرق پڑتا۔"

"بکواس مت کرو۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ میرے گھر میں جو ولادت ہونے والی ہے' وہ میری توقع کے خلاف ہو گی۔"

"یہ آپ سوچ رہے ہیں۔ ورنہ اگر کوئی عورت آپ کی بیٹی بننا چاہتی ہے۔ تو کہہ دیجئے' ہاں تم میری بیٹی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ پتا نہیں وہ کون بدذات تھی۔ آئندہ فون پر مجھے مخاطب کرے گی تو اس کی اچھی طرح خبر لوں گا۔ تم بھی اچھی طرح سن لو۔ اگر یہ تمہارے ہتھکنڈے ہیں تو تم کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ جو میں چاہتا ہوں' میرے گھر میں وہی ہو گا۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا پھر نیچے دفتر میں چلا گیا۔ جب صبح کے وقت گیراج کھلتا تھا تو وہاں کام کرنے والا کوئی ایک لڑکا اوپر فلیٹ کی صفائی کرتا تھا۔ زیبی نے ایسے ہی ایک لڑکے کو پچاس روپے کا لالچ دیا۔ پھر کہا۔ "جو میں کہوں گی وہی کرتے رہو گے تو تمہیں اور پچاس روپے دوں گی۔"

وہ راضی ہو گیا۔ ایک دن ماسٹر عبداللہ اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ اپنی بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر آ کر بیٹھا تو سامنے ہی دیوار پر نظر پڑی۔ دیوار پر بڑے بڑے

حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "بے بی" پھر اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "نو بابا۔"

یہ پڑھتے ہی وہ اچھل پڑا۔ فوراً ہی دفتر سے نکل کر گیراج میں آیا۔ پھر اس نے ایک ایک لڑکے کو بلا کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ "دیوار پر کس نے لکھا ہے؟"

سب نے انکار کیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کل شام کو کس نے دفتر کا شٹر بند کیا تھا؟"

راجو نے کہا۔ "میں ہی بند کیا کرتا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے ہی اس دیوار پر لکھا ہے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ایسی باتیں لکھوں اور یہ لکھ کر میں کیا حاصل کر لوں گا۔"

اس نے ایک ایک لڑکے کو سختی سے ڈانٹ کر کہا۔ "اگر میں نے آئندہ کسی کو ایسی حرکت کرتے پکڑ لیا تو اسے الٹا لٹکا کر ماروں گا اور دھکے دے کر گیراج سے نکال دوں گا۔ اس کی تنخواہ بھی نہیں دوں گا۔"

وہ دفتر میں واپس آیا۔ پھر اس نے راجو کو بلا کر کہا۔ "دیکھو تم میرے بڑے بیٹے ہو۔ میرا دایاں بازو ہو۔ میرے بعد تم ہی یہاں کا کاروبار سنبھالو گے۔ اس لیے تمہیں ہر ایک پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ بہرحال جو کچھ لکھا ہوا ہے اسے مٹا دو اور یہاں کے لڑکوں پر نظر رکھو۔"

"ابو! آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ کس کی شرارت ہے؟"

"میں سمجھ رہا ہوں مگر ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"اور آپ شاید کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔ آپ کو اس بار میری ماں کی طرح کوئی گونگی بیوی نہیں ملی ہے۔"

"کیا بکتے ہو۔ میرے سامنے جو بھی زبان کھولتا ہے میں اس کی زبان کھینچ لیتا ہوں۔"

"شاید اسی لیے ہماری نئی امی آپ کے سامنے زبان نہیں کھولتی ہیں۔ اپنی زبان کھچوانا نہیں چاہتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔"

وہ اوپر فلیٹ میں آیا۔ پھر اس نے زیبی سے کہا۔ "میں خوب جانتا ہوں، تم تعلیم یافتہ ہو۔ میں زبان پر لاکھ پہرے بٹھاؤں، تم اپنی بات مختلف انداز میں سمجھانے کے طریقے جانتی ہو۔"

"اب کیا ہوا۔ کوئی نیا الزام دینا چاہتے ہیں۔"

"میرے دفتر کی دیوار پر ایسی بات لکھی ہے جسے میں پسند نہیں کرتا اور یہ تمہاری شرارت ہے۔ یاد رکھو، اگر ثبوت مل گیا تو میں تمہاری ہڈی پسلی توڑ کے رکھ دوں گا۔"

"آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں، اور یہ دھمکی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ کے بس میں ہوں۔ دھمکی دینے کے بجائے سیدھی طرح میرا گلا گھونٹ دیجیے۔ مجھے مار ڈالیے۔ میں تو آپ کے اختیار میں ہوں۔"

"ابھی نہیں، وقت آنے دو۔"

وہ پھر غصے میں وہاں سے چلا آیا۔ دو دن بعد اسے ڈاک کے ذریعے ایک لفافہ ملا۔ اس نے اسے چاک کر کے دیکھا تو ایک ننھی سی نوزائیدہ بچی کی تصویر تھی۔ اس تصویر کے پیچھے لکھا تھا۔ "ابو! السلام علیکم۔ میں جلد ہی آ رہی ہوں۔ آپ نے میرا نام بھی تجویز نہیں کیا ہے۔ کوئی اچھا سا نام سوچ کر رکھیے گا۔ فقط، آپ کی گڑیا بیٹی۔"

اس نے تصویر کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پھر اسی طرح مٹھی بھینچے ہوئے اوپر فلیٹ میں آیا۔ زیبی کے سامنے مٹھی کھولتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا ہے؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "کیا ہے؟"

"دیکھو، پوچھتی کیا ہو؟"

اس نے مڑی تڑی تصویر کو اچھی طرح سیدھا کر کے دیکھا۔ وہ غرا کر بولا۔ "تصویر کو نہیں، تحریر کو دیکھو۔ اس کے پیچھے ہے۔"

اس نے پیچھے تحریر پڑھی۔ پھر بولی۔ "میں خود حیران ہوں کہ آپ کو کون اس طرح چھیڑ رہا ہے۔"

"رہا ہے نہیں، چھیڑ رہی ہے۔ اگر اس کا پتا معلوم ہو جائے تو........"

"آپ خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں، جھنجلانے کی کیا ضرورت ہے، کوئی شرارت کر رہا ہے کرنے دیجیے۔ آپ اسے پھاڑ پھینک دیجیے۔"

اس نے زیبی سے وہ تصویر چھین لی۔ پھر اس کے سامنے ٹکڑے کرنے لگا۔ ایک کے بعد دو، دو کے بعد چار، چار کے بعد آٹھ۔ اس کے ٹکڑے کرتا ہی چلا گیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا، جیسے انتقام لے رہا ہو۔ تصویر بھیجنے والی کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ زیبی ہنسنے لگی۔ پھر اس کی ہنسی طویل ہونے لگی۔ پہلے تو ماسٹر عبداللہ نے ڈانٹ کر کہا۔

"بند کرو اپنی ہنسی۔"

لیکن اس کے ڈانٹنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہنستے ہوئے پلنگ کے پاس آئی۔ پھر پلنگ پر گر پڑی۔ وہاں اوندھے منہ گر کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے پھر اٹھ بیٹھی۔ عبداللہ نے اس کے دونوں بازوؤں کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "خاموش ہو جاؤ' ورنہ طمانچہ رسید کروں گا۔"

لیکن وہ خاموش نہیں ہوئی۔ اس کی ہسٹریائی ہنسی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اچانک عبداللہ نے ایک طمانچہ رسید کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کر پلنگ پر چاروں شانے چت ہو گئی۔

☆=========☆=========☆

ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑا۔ وہ ہوش میں آگئی لیکن گم صم رہی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "بھئی' میں پہلے کہہ چکا ہوں' یہ کوئی نفسیاتی کیس ہے۔ کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرو۔"

دوسری طرف زیبی کی سہیلی نے اپنے شوہر سے کہا۔ "مجھے جو کرنا تھا وہ میں کر چکی ہوں۔ اب آپ اپنا کام کریں۔"

اس کے شوہر نے کہا۔ "بھئی یہ کیا حماقت ہے۔ کسی کو فون کر کے یہ کہہ دینے سے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوگی یا ڈاک کے ذریعے کسی نوزائیدہ بچی کی تصویر بھیج دینے سے ایک خردماغ شوہر بیٹی کے سلسلے میں قائل تو نہیں ہو جائے گا۔"

"میں قائل نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔ اتنا جانتی ہوں کہ اگر جارحیت کے مقابلے میں مدافعت نہ کی جائے تو جارحیت کرنے والے کے حوصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مدافعت خواہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو مگر ہونی چاہیے۔ زیبی براہِ راست اپنے شوہر سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتی لیکن بالواسطہ اس کے شوہر کو یہ تو سمجھایا جا سکتا ہے کہ بیٹی بھی ہو سکتی ہے اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ متذبذب ہو جائے گا' اور نہ بھی ہوا تو جھنجلاہٹ کا شکار ضرور ہو گا۔ اس طرح زیبی ذہنی مریضہ نہیں بنے گی۔ اسے اطمینان ہو گا کہ اس کا شوہر جو ظلم کر رہا ہے' اس کا انتقام وہ بالواسطہ لے رہی ہے اور اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ کل میں دفتر جاؤں گا تو وہاں سے ماسٹر عبداللہ کو فون کے ذریعے جھنجلاہٹ میں مبتلا کروں گا۔"

دوسرے دن ماسٹر عبداللہ' زیبی کو لے کر ایک ماہرِ نفسیات کے پاس پہنچا۔ ماہرِ

نفسیات نے زیبی سے تنہائی میں بہت سے سوالات کیے۔ اسے حوصلہ دیا کہ وہ کھل کر گفتگو کرے اور کوئی بات اس سے نہ چھپائے۔

زیبی نے اس کے تمام سوالوں کے جواب دیے' لیکن ماہرِ نفسیات مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے ایک کیسٹ ریکارڈر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس کمرے میں تنہا رہو گی۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو اندر سے دروازے کو بند کر لو اور یہاں اطمینان سے بیٹھ کر ریکارڈر کو آن کرو۔ جو بھی باتیں تمہارے دماغ میں آتی ہوں' انہیں بے تکان اور بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی جاؤ' کوشش کرو کہیں رکنے نہ پاؤ۔ جہاں رکاوٹ ہو نہ رکو' فوراً جو بات دماغ میں آتی ہے' اسے ادا کر دو۔ چاہے وہ باتیں کتنی ہی بے ربط ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر ماسٹر عبداللہ کے پاس چلا گیا اور اسے باتوں میں لگا لیا۔ زیبی نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر ریکارڈ کو آن کر کے بولنے لگی۔ جب اس نے بولنا شروع کیا تو جانے کہاں کہاں سے اس کے دماغ میں باتیں آتی رہیں اور وہ بولتی چلی گئی۔ کیسٹ کے اختتام پر اسے یہ یاد نہ رہا کہ وہ پینتالیس منٹ تک کیا بولتی آئی ہے۔

ماہرِ نفسیات نے کمرے میں آ کر کہا۔ "اطمینان رکھو' تم جو بات اپنے شوہر سے چھپانا چاہتی ہو۔ میں ان پر ظاہر نہیں کروں گا۔ میں صرف تمہارا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے ماسٹر عبداللہ کو بلا کر کہا۔ "آپ اپنی وائف کے ساتھ جا سکتے ہیں' میں نے اپنے طور پر جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے' دو دن بعد آپ کو بتاؤں گا۔"

وہ زیبی کے ساتھ واپس آگیا۔ اسے فلیٹ میں چھوڑ کر اپنے دفتر میں آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کاروں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں لوگ آتے ہی رہتے تھے یا پھر فون کے ذریعے ابتدائی معاملات طے ہوتے رہتے تھے۔ ایسے ہی وقت ایک فون نے اسے چونکا دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "میں ماسٹر عبداللہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں ماسٹر عبداللہ بول رہا ہوں۔ فرمائیے۔"

"ماسٹر! کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی آبادی کیوں بڑھ رہی ہے؟"

"کیا آپ خاندانی منصوبہ بندی کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک محبِ وطن ہوں۔ پاکستان کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی پر تشویش کرے اور اس کا سدِ باب کرے۔ میں

آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف اتنا کہوں کہ ہمارے ہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے ہاں بیٹیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس امید پر بچے پیدا کرتے چلے جاتے ہیں کہ شاید آئندہ ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو لیکن جن کے ہاں بیٹے ہی بیٹے ہوتے ہیں' ان میں سے بہت کم لوگ بیٹی کی تمنا کرتے ہیں۔ ہمارے لوگ بیٹوں کی تعداد بڑھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے ہاں بیٹی ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیٹے پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح آبادی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا یہ تجزیہ درست ہو۔"

"ضروری ہے۔ آبادی کے اضافے میں کئی عوامل کام کرتے ہیں۔ ان میں یہ باتیں بھی ہیں جو میں بیان کر چکا ہوں۔"

"آپ مجھے یہ باتیں کیوں سنا رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ میں ایک بیٹا ہوں اور پیدا ہونا چاہتا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"بکواس نہیں' حقیقت ہے۔ پہلے میں آپ کے ہاں پیدا ہونا چاہتا تھا۔ پھر خیال آیا جن کے ہاں بیٹیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہوں' میں ایسے ہی کسی گھر میں پیدا ہو جاؤں گا تو میری پیدائش کے بعد وہاں مزید کسی بچے کی تمنا نہیں رہے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یو آر اے فرسٹ کلاس فول۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ کیا چالبازی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت اسے بہت ضروری کام تھے۔ شام کو گیراج اور دفتر بند کرنے کے بعد اوپر فلیٹ میں آیا۔ زیبی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کمرے میں آکر پوچھا۔ "آخر تم کب تک ایسی بے تکی چالیں چلتی رہو گی۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی پھر ایک فون آیا تھا۔"

"آپ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آپ نے اسے بیٹی تسلیم کر لیا ہے۔"

"اس مرتبہ بیٹا تھا۔"

زیبی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں' وہ کہہ رہا تھا' میرے ہاں پیدا نہیں ہو گا۔ کسی ایسے گھر میں پیدا ہو گا جہاں بیٹیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کیا بکواس ہے۔ کیا مجھ پر کوئی نفسیاتی اثر ڈالا جا رہا ہے۔ مجھے

پاگل بنانے کا ارادہ ہے۔"

"میرا ارادہ کچھ نہیں ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ بار بار جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھو زیبی! مجھے سچ سچ بتا دو' یہ کون لوگ ہیں جو مجھے فون کرتے ہیں۔"

"اگر میں جانتی تو ضرور بتا دیتی۔"

"اگر کسی دن میں ان فون کرنے والوں تک پہنچ گیا تو ان کے ایسے ہی ٹکڑے کروں گا جیسے اس تصویر کے کیے تھے۔"

"ہاں' مجھے یاد آیا۔ جب آپ تصویر کے ٹکڑے کر رہے تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔ کیا میں پھر ہنسنا شروع کر دوں؟"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ "خبردار' ذرا بھی نہ ہنسنا۔ تمہاری ہنسی میرے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔"

"شاید آپ نہیں جانتے' رونا اور ہنسنا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یہ بے اختیاری چیز ہوتی ہے۔"

"میں کہتا ہوں' بکواس بند کرو۔"

"اگر میں کہتی رہوں گی تو آپ طمانچہ ماریں گے اور میں طمانچہ کھا کر بے ہوش ہو جاؤں گی۔ پھر وہی ڈاکٹر' وہی بھاگ دوڑ وہی پریشانیاں۔"

وہ ذرا دیر تک اسے گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر غصے سے کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ دو دن بعد ماہر نفسیات نے اسے اپنے پاس بلا کر کہا۔ "میں نے آپ کی وائف کے سلسلے میں بڑی توجہ سے اسٹڈی کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ آپ اور آپ کی وائف دونوں ہی دو طرفہ آرزوؤں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یعنی آپ اپنی وائف سے بیٹے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ آپ کی وائف اس مطالبے کو تسلیم نہیں کرتی ہیں لیکن ان کے اندر ایک بیٹی کی خواہش بھی ہے۔ وہ اس خواہش کا اظہار مختلف ذرائع سے کرتی ہیں اور آپ اس خواہش کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ یعنی آپ بیٹے کے ساتھ ساتھ بیٹی بھی چاہتے ہیں۔"

ماسٹر عبداللہ نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"دیکھیے! میں کسی کی زبان سے سن کر جھوٹ اور سچ تسلیم نہیں کرتا۔ میرا اپنا طریقہ کار ہے۔ اس کے ذریعے میں نے یہی معلوم کیا ہے کہ آج کل آپ رات کو جب

گہری نیند میں ہوتے ہیں تو بڑبڑاتے ہیں اور بڑبڑاہٹ یہی ہوتی ہے کہ آپ کو ایک بیٹی چاہیے۔"

وہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے' ڈاکٹر! یہ جھوٹ ہے میری وائف نے غلط بیانی کی ہے۔"

"میں غلط اور صحیح بیان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے دیکھا تھا کہ میں نے آپ کی وائف کو ایک کمرے میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ میں بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ وہ اپنے طور پر جو کچھ کہنا چاہتی تھیں' وہ کہا ہے اور وہی میرے پاس ریکارڈ ہو گیا۔"

"میں وہ کیسٹ سننا چاہتا ہوں۔"

"سوری' میں ذہنی مریضوں کا معالج ہوں اور اپنے مریضوں کے راز کسی دوسرے پر ظاہر نہیں کرتا۔"

"میں کوئی دوسرا نہیں ہوں۔ اپنی بیوی کا شوہر ہوں۔ اور میں ہی آپ کی فیس وغیرہ ادا کر رہا ہوں۔ مجھے حق پہنچتا ہے۔"

"جی نہیں' میری مریضہ آپ کی بیوی ہے۔ آپ نہیں ہیں۔ آپ تحمل سے میری بات سننا اور سمجھنا چاہتے ہیں تو سن لیجیے ورنہ آپ کی مرضی۔"

"فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔"

"میں آپ کو مختصر طور پر یہ بتا دوں کہ جب میاں بیوی کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچتے تو بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی اولاد کی بات لیجیے۔ بظاہر آپ نے بیٹے کے سلسلے میں آخری فیصلہ سنا دیا ہے اور اس فیصلے کو آپ کی بیوی نے بھی تسلیم کر لیا ہے لیکن دماغ کے کئی خانے ہوتے ہیں۔ لاشعور میں جو بات چھپی ہوتی ہے' اسے آپ نہیں سمجھ سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں اور یہی میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ آپ کے لاشعور میں ایک بیٹی کی خواہش چھپی ہوئی ہے۔ جسے آپ شعوری طور پر کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اب نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ آپ میاں بیوی کسی آخری فیصلے تک نہیں پہنچ سکتے۔ یعنی بیٹا اور بیٹی کے درمیان الجھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں جو اولاد پیدا ہوتی ہے' اس پر بھی ذہنی طور پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً لڑکی پیدا ہو تو اس میں لڑکے کی خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ لڑکوں کی طرح بولنا چاہتی ہے' لڑکوں کی طرح کپڑے پہننا چاہتی ہے۔ پھر مزاج بھی سخت ہوتا ہے۔

وہ لڑکیوں والی نزاکت نہیں ہوتی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟ یعنی اگر آپ کی بیوی نے اپنی خواہش کے مطابق بیٹی تو پیدا کی لیکن آپ کا حکم اس کے ذہن میں نقش رہا کہ وہ بیٹا پیدا کرنا چاہتی تھی۔ بیٹا تو پیدا نہ کر سکی لیکن لڑکی کو مزاجاً بیٹا بنا دیا۔ اسی طرح اگر آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہو گا تو وہ مزاجاً لڑکیوں جیسا ہو گا۔ لڑکیوں جیسی نزاکت ہو گی کیونکہ آپ کے حکم کے مطابق وہ بیٹا پیدا کرے گی لیکن چونکہ بیٹی دل و دماغ میں نقش رہی تھی' اس لیے بیٹی کی خصوصیات اس میں آجائیں گی۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا لیکن بعض حالات میں ایسا ہو جاتا ہے نفسیاتی عوامل میں ایک عمل اور ردعمل یہ بھی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔ اب آپ اپنے طور پر سوچیے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھیں۔ اس پر کسی قسم کا ذہنی دباؤ نہ ڈالیں اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل کا یقین اسے دلاتے رہیں۔ تبھی بات بنے گی ورنہ آپ کی بیوی ذہنی مریضہ بنتی رہے گی اور بچے کی پیدائش تک نتائج کیا ہوں گے۔ یہ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

بہت سے لوگ اپنے عقائد اور ذاتی تجربات کے نتائج کو ڈاکٹروں کے مشوروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ماسٹر عبداللہ کے ذاتی تجربات یہی تھے کہ عورت پر ذہنی دباؤ ڈالا جائے' تبھی وہ حسبِ منشا اولاد پیدا کرتی ہے۔ اس نے ماہرِ نفسیات کے مشورے کو اپنے تجربات کے سامنے اہمیت نہیں دی بلکہ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ زیبی مختلف ذرائع سے اس کے دماغ میں ایک بیٹی کی خواہش پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اب تک فون پر جن لوگوں نے اسے احمق بنانے کی کوشش کی تھی اور ڈاک کے ذریعے بچی کی تصویر بھیجی تھی۔ وہ سب زیبی کے اشاروں پر ہوا تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر پہلے تو نرمی سے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ' وہ کون لوگ ہیں جو مجھے فون کرتے ہیں اور تمہارے اشاروں پر میرے دماغ میں بیٹی کی خواہش پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں کہہ چکی ہوں' میں نہیں جانتی۔ میں نے کسی کو ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔"

اسے غصہ آگیا۔ اس نے زیبی کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ "میں جتنا سیدھا ہوں' اتنا ہی ٹیڑھا بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں تم ضدی ہو۔ جو بات چھپانا چاہتی ہو اسے کبھی ظاہر نہیں کرو گی۔ میں بھی نہیں پوچھوں گا کہ مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔ اب میری سمجھ میں ساری باتیں آگئی ہیں۔ آئندہ تم جتنے ہتھکنڈے بھی آزماؤ گی

وہ سب بے اثر ہوں گے۔"

اس نے زیبی کو دھکا دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کا رویہ وہی تھا جو پہلی بیوی کے ساتھ تھا۔ وہی رویہ جو اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ شاید اس کے باپ نے بھی اپنی بیوی کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا ہو گا۔ ایسے لوگ اپنی ماں اور دادی کی مجبوریوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ یہ بھی سمجھنا نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹیاں بیاہ کر جائیں گی تو ان کے شوہروں کا رویہ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ ان کے ہاں وراثت کی کتاب میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ماں سے محبت کرو۔ بہن کو غیرت سمجھو' بیٹی کو رو کر رخصت کرو لیکن کسی کی بیٹی کہیں جا کر بیوی بن جائے تو اس سے حاکمانہ سلوک کرو۔ اس کو مارو۔ اس کو مجبور کرو کہ وہ بیٹا پیدا کرے تاکہ خاندان کا نام روشن ہو۔

☆==========☆==========☆

زچگی کا وقت قریب آگیا۔ زیبی میٹرنٹی ہوم میں داخل ہو گئی۔ اب سب ہی کو یہ فکر تھی کہ بیٹا ہو گا یا بیٹی۔ زیبی کے والدین کو اپنے داماد کا عندیہ معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ بیٹے کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ زیبی کی حالت بڑی تشویش ناک تھی۔ کبھی کبھی اس پر ہنسنے کا دورہ پڑتا تھا۔ ماسٹر عبداللہ پریشان ہو کر کہتا۔ "تم عجیب عورت ہو۔ میں نے آج تک کسی کو صدمے سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر تمہارے دل میں کوئی صدمہ ہے یا تم کسی اور وجہ سے دکھ اٹھا رہی ہو تو تمہیں رونا چاہیے۔"

"میں کیا کروں۔ میں نے کہا نا' رونا اور ہنسنا آدمی کے اختیار میں نہیں ہے۔ ان حالات میں مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ آپ کو میری ہنسی سے دکھ پہنچتا ہے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔"

وہ بیٹے کی خوش خبری سننے کے لیے بے چین تھا۔ تیسرے دن زیبی کو لیبر روم میں لے جایا گیا۔ وہ وہیں میٹرنٹی ہوم میں موجود تھا اور بے چینی سے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک انتظار گاہ میں بیٹھا رہا پھر باہر آگیا۔ کوریڈور کے دوسری طرف ہی لیبر روم تھا۔ اس کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ ایک نرس کسی کام سے باہر آئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے نرس کو دیکھا مگر وہ اسے نظرانداز کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی ماسٹر عبداللہ نے اپنی ساس سے کہا۔ "آپ تو کچھ پوچھ سکتی ہیں۔ خاموش کیوں کھڑی ہیں۔"

ساس نے آگے بڑھ کر نرس سے کہا۔ "بیٹی! سب خیریت تو ہے۔"

"جی ہاں' خیریت ہے۔"

"میں اس کی ماں ہوں۔ کیا اندر آسکتی ہوں؟"

"اگر آپ کو اندر آنا ہے تو آپ ہی سب کچھ کر لیں۔ یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بڑی مشکل ہے۔ آپ لوگوں سے ایک جگہ بیٹھا نہیں جاتا۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے دوران زیبی کی ہلکی ہلکی کراہیں سنائی دی تھیں۔ اکثر مشرقی عورتیں اتنی باحیا ہوتی ہیں کہ ایسے وقت تکلیف کی انتہا میں بھی اپنی چیخوں کو دبائے رکھنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ ناکامی ہو تو منہ میں آنچل ٹھونس لیتی ہیں۔ روتے ہوئے' کراہتے ہوئے یا اپنی آواز سناتے ہوئے ایسے وقت بھی انہیں حیا کا پاس رہتا ہے۔

پھر بند دروازے کے باوجود اندر سے نوزائیدہ بچے کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہا تھا یا رو رہی تھی۔ باہر کھڑے ہوئے رشتے داروں میں تجسس اور اضطراب بڑھ گیا۔ ماسٹر عبداللہ نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "لڑکا ہے۔ میں آواز سن کر یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ لڑکا ہے۔"

لیبر روم کے اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ باہر سب بند دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ شاید بچے کو چپ کرا دیا گیا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی دروازہ کھلا۔ پھر ایک نرس نے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "زچہ کی ماں کون ہے؟"

ماسٹر عبداللہ کی ساس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں ہوں۔ خیریت تو ہے؟"

"ہاں' خیریت ہے۔ اندر آجاؤ۔"

زیبی کی ماں اندر چلی گئی۔ ذرا دیر بعد ہی اچانک زیبی کے قہقہے سنائی دیئے۔ سب چونک گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر دورہ پڑ رہا ہے۔ زیبی کا باپ پریشان ہو کر دعائیں مانگنے لگا۔ ماسٹر عبداللہ دروازے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ابھی اسے توڑ کر اندر چلا جائے گا۔ اتنے میں ایک نرس باہر آئی۔ تیزی سے ایک طرف جانے لگی۔ ماسٹر عبداللہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "نرس کیا ہوا؟ بیٹا؟"

"نہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"اے مسٹر! زبان سنبھال کر گفتگو کرو۔ کیا تم مجھے اپنی گھر والی سمجھتے ہو؟"

وہ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "سوری، کچھ بتایئے تو سہی۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم ہے۔ میرے پیچھے نہ آؤ۔ مجھے کام کرنے دو۔ مریضہ کی ذہنی حالت تشویش ناک ہے۔"

وہ چلی گئی۔ ماسٹر عبداللہ پریشان ہو کر پھر لیبر روم کی طرف آیا۔ اپنے سسر سے کہنے لگا۔ "یہ آپ کی بیگم صاحبہ اندر جا کر کیوں بیٹھ گئی ہیں۔ انہیں آ کر ہمیں کچھ بتانا تو چاہیے۔ وہ نرس کی بچی کہہ رہی ہے کہ لڑکا بھی نہیں ہے، لڑکی بھی نہیں ہے، بکواس کر رہی ہے۔ ہم نے اپنے کانوں سے بچے کے رونے کی آواز سنی ہے۔ بچہ ہوا ہے۔"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ سب ہی پریشان تھے۔ کیونکہ رہ رہ کر زیبی کے قہقہے سنائی دیتے تھے۔ پھر اچانک ہی قہقہے رک گئے۔ ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ انتظار بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ کوئی نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔ پھر دروازہ کھلا۔ اس بار زیبی کی ماں باہر آئی۔ وہ پریشان تھی۔ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ ماسٹر عبداللہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا، بیٹا؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔"

وہ غرا کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے، بیٹی!"

وہ پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں!"

"ارے تو کیا ہوا ہے کچھ تو بتاؤ؟"

"بیٹے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کی تشخیص نہیں ہو سکتی کہ وہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ میں کیا بتاؤں ڈاکٹر خود حیران ہیں۔"

"نہیں۔" وہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ "نہیں ایسی اولاد میری نہیں ہو سکتی یہ جھوٹ ہے، یہ بکواس ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے لیبر روم سے باہر آ کر سخت لہجے میں کہا۔ "اے مسٹر! کیا آپ کو احساس نہیں ہے کہ یہاں دوسرے مریض بھی ہیں۔ اس طرح چیخ چیخ کر کیوں باتیں کر رہے ہیں۔ جایئے، باہر جایئے۔ یہاں کیوں مجمع لگائے ہوئے ہیں۔"

وہ نرم لہجے میں بولا۔ "سوری ڈاکٹر! لیکن یہ کیا قصہ ہے۔ نہ بیٹا ہے۔ نہ بیٹی ہے۔

پھر کیا ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "میری زندگی میں پہلا کیس ایسا ہوا ہے۔ ایب نارمل بچہ ہے۔ ویسے میں نے اس کے متعلق سنا ہے۔ اپنے سینئر ڈاکٹروں سے میں اس سلسلے میں مشورہ کروں گی۔ پوچھوں گی کہ اس نوزائیدہ بچے کو آپریشن کے ذریعے لڑکی بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

"نہیں ڈاکٹر! نہیں اگر آپریشن کی بات ہو تو اسے لڑکی کے بجائے لڑکا بنایئے۔"

"مسٹر! آپ مضحکہ خیز بات کر رہے ہیں۔ وہ نوزائیدہ بچہ ایسا ہے کہ شاید آپریشن کے بعد اسے لڑکی بنانا ممکن ہو مگر لڑکا نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے دفتری کمرے کی طرف جانے لگی۔ ماسٹر عبداللہ نے اپنی ساس اور سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نان سنس، تمہاری بیٹی بے حیا ہے۔ ایب نارمل ہے۔ یہ میری اولاد نہیں ہو سکتی۔ میں اس کا منہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں اسے ماہرِ نفسیات کی باتیں یاد آ رہی تھیں کہ وہ اپنی شریکِ حیات کو خوش رکھے۔ اس کے مزاج کے مطابق باتیں کرے۔ اس پر اپنی طرف سے کوئی دباؤ نہ ڈالے۔ بیٹا یا بیٹی کی پیدائش قدرت پر چھوڑ دے۔ ورنہ اس کی بیوی متذبذب ہو جائے گی۔ اس کے دماغ میں بیٹا اور بیٹی دونوں گڈمڈ ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں بیٹا ہوا تو اس میں بیٹی کی خاصیت ہو گی اور بیٹی ہوئی تو وہ بیٹے کی خاصیت رکھے گی لیکن یہاں تو بیٹا ہوا تھا نہ بیٹی۔ یہ بات درست نکلی تھی کہ اس کے دماغ میں بیٹا اور بیٹی گڈمڈ ہو گئے تھے۔

☆=========☆=========☆

اس نے اپنی دھمکی پر عمل کیا۔ پھر زیبی کو دیکھنے نہیں گیا۔ اس کے متعلق خبر ملتی رہتی تھی کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بہکی بہکی باتیں کرتی ہیں۔ اپنے بچے کو دیکھتی ہے تو پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا بچے کو اس سے دور رکھا جاتا ہے۔

ایک دن اس کے سسر نے آ کر اسے سمجھایا۔ "بیٹا! غصہ تھوک دو۔ اللہ کی مرضی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ زیبی کی ذہنی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ ایسے وقت تمہیں اس کے پاس رہنا چاہیے۔ تم اسے دلاسا دو گے، اس کی دلجوئی کرو گے تو وہ جلد

صحت یاب ہو جائے گی۔"

اس نے رکھائی سے کہا۔ "میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں کسی کی دل جوئی کرتا رہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ اس کا علاج کرائیں۔ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ اس سے زیادہ میں آپ کی بیٹی کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

وہ تین ماہ تک اپنے میکے میں رہی۔ وہیں اس کا علاج ہوتا رہا۔ جب وہ ذرا نارمل ہوئی تو ماسٹر عبداللہ نے کہا۔ "میں آپ کی بیٹی کو تو لے جا سکتا ہوں مگر اس کی اولاد کو نہیں لے جا سکتا۔ میرے دوست احباب نے اور میری پہلی بیوی کے رشتے داروں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا' بچہ پیدا ہوا تھا' مر گیا۔ میں کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا ہے۔ یہ میرے لیے شرم کی بات ہے۔"

زیبی نے کہا۔ "میں دودھ پینے والے بچے کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ آپ اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے تو نہ دیکھیں۔ میں اسے دوسرے کمرے میں رکھا کروں گی۔"

"میں لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ بچہ مر چکا ہے۔ پھر میں اسے کیسے لے جا سکتا ہوں۔"

"آپ کے کہہ دینے سے میرا بچہ مر نہیں سکتا۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔"

اس نے بے بسی سے زیبی کو دیکھا۔ پھر ذرا نرم ہو کر بولا۔

"دیکھو! میں نے دو دو شادیاں کیں پھر بھی تنہا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ایسا کیوں نہ کریں کہ جب تک یہ بچہ دودھ پیتا رہے' اس وقت تک تم میکے میں رہو۔ بعد میں اسے نانا' نانی کے پاس چھوڑ دیں گے۔ اس دوران میں آتا رہوں گا۔ تم کبھی کبھی میرے ساتھ تفریح کے لیے باہر چلا کرو۔ بچے کو یہاں چھوڑ دیا کرو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے تو تم بچے سے دور رہ سکتی ہو۔"

زیبی راضی ہو گئی۔ بچے کو نانا' نانی کے پاس چھوڑ کر اس کے ساتھ تفریح کے لیے باہر نکلی۔ وہ بہت خوش تھا۔ راستے میں اچھی اچھی باتیں کر رہا تھا۔ بڑے اچھے موڈ میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "پہلے ہم اپنے فلیٹ چلتے ہیں۔ اس کے بعد کسی اچھے ریستوران سے رات کا کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔"

وہ فلیٹ میں آ گئے۔ ماسٹر عبداللہ اتنی محبت سے پیش آ رہا تھا کہ زیبی ماضی کی شکایتیں بھول گئی تھیں۔ وہ تسلیم کرتی تھی کہ اس کا شوہر ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ بس اس کی بیٹے والی ضد نے پریشان کر رکھا تھا۔ زیبی نے پریشان ہو کر کہا۔ "دیکھیے اب ہمارے درمیان کچھ فاصلہ رہنا چاہیے۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو ہم غیر تو نہیں ہیں۔ میاں بیوی ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"ہو گا کیا۔ میں اس بار بیٹا چاہتا ہوں۔ اسی شرط پر تمہیں معاف کر سکتا ہوں۔"

"بیٹا۔" اس نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔ پھر ہنسنے لگی۔

"بھئی' میں بیٹا کہہ رہا ہوں۔ کوئی لطیفہ تو نہیں سنا رہا ہوں کہ تم ہنس رہی ہو۔"

اس کی ہنسی طویل ہونے لگی۔ پھر وہ بلند قہقہوں میں تبدیل ہونے لگی۔ عبداللہ نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "یہ کیا پاگل پن ہے۔ ہوش میں آؤ۔ تم کیوں ہنس رہی ہو؟"

وہ ہنستی رہی۔ ہنستی چلی گئی۔ پھر ہنستے ہنستے نڈھال ہو کر گرنا ہی چاہتی تھی کہ عبداللہ نے اسے سنبھال لیا۔ دونوں بازوؤں میں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میں نے ایک عورت سے نہیں مصیبت سے شادی کر لی ہے۔"

جھنجلانے سے کیا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ پھر اس نے اپنے ساس سسر کو اطلاع دی۔ تمہاری بیٹی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ یہ پاگل ہے پاگل رہے گی۔ لہٰذا اسے لے جاؤ۔

اس کے ماں باپ آئے۔ وہ ماسٹر عبداللہ کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن زیبی نے انہیں منع کر دیا۔ وہ خود میکے جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اس لیے ماں باپ کے ساتھ چلی گئی۔ ان کے درمیان تقریباً دو ماہ کشیدگی رہی پھر ماسٹر عبداللہ کو ہی جھکنا پڑا۔ وہ پھر زیبی کے پاس گیا۔ اس نے تنہائی میں کہا۔ "میں نے اولاد کے لیے شادی کی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" وہ ہنسنے لگی۔

"دیکھو' ہنسنا نہیں۔ میرے لیے مصیبت نہ بننا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "بیٹا' ہاہا' ہاہا۔ بیٹا۔"

پھر اس کی ہنسی طویل ہونے لگی۔ عبداللہ گھبرا کر اس سے دور ہو گیا۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر بولا۔ "تم ڈھونگ رچاتی ہو۔ مجھ سے دور رہنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔ میں

بیوقوف نہیں ہوں۔ تم بہت چالاک ہو مگر تمہاری چالاکی میرے سامنے نہیں چلے گی۔"

وہ غصے میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا اور وہ ہنستی جا رہی تھی۔ پھر ہنستے ہنستے اپنے بستر پر گر پڑی۔ عبداللہ وہاں سے بھاگا۔ دوسرے کمرے میں موجود اس کی ساس نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"لعنت ہے تمہاری بیٹی پر وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ جاؤ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اب میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گا۔"

وہ غصے میں وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے دن اس کا غصہ کچھ کم ہوا تو اس نے سوچا' کسی اچھے دماغی امراض کے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ زیبی کا باقاعدہ علاج کرانا چاہیے۔ اس نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر ایک بہت ہی مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ اپنی بیوی کی ہسٹری تفصیل سے بیان کریں۔ اس کے بعد میں کوئی مشورہ دے سکوں گا۔"

اس نے زیبی سے شادی کرنے' پھر اس کے ماں بننے' تک کے تمام واقعات بیان کر دیے۔ ڈاکٹر توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ کے بیان سے پتہ چلتا ہے وہ ایک محبت کرنے والی بیوی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے اور آپ کی خواہش کے مطابق بیٹا پیدا ہو لیکن اس کے اپنے اندر بھی ایک تمنا ہے۔ جو اس کے راستے میں حائل ہے۔ ہمارے ہاں کی لڑکیاں بچپن سے گڈے گڑیا کا کھیل کھیلتی ہیں۔ ان کا بیاہ رچاتی ہیں۔ پھر شادی والے گھر میں جاتی ہیں۔ وہاں دلہن کو رخصت ہوتے دیکھتی ہیں۔ رخصتی کا ماحول اتنا درد انگیز ہوتا ہے کہ وہ تاثر ان لڑکیوں کے دماغ میں بیٹھ جاتا ہے۔ شادی کے بعد جہاں وہ بیٹے کی تمنا کرتی ہیں' وہاں ایک بیٹی کی بھی آرزو ہوتی ہے تاکہ اسی طرح سے دلہن بنائیں اور اسی دردناک ماحول میں اسے رخصت کریں۔ کیا آپ میرے ایک مشورے پر عمل کریں گے۔"

"ضرور ڈاکٹر صاحب! اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"دیکھیے' آپ کی بیوی کا علاج صرف ایک ہے۔ آپ ان کے پاس جائیں۔ محبت سے پیش آئیں اور اسے صاف طور سے کہہ دیں کہ آپ بیٹا نہیں' بیٹی چاہتے ہیں۔"

"لیکن میں بیٹی نہیں چاہتا۔"

"اس کا مطلب ہے' آپ اپنی بیوی کو دماغی طور پر صحت مند دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"چاہتا ہوں' مگر کوئی دوسرا طریق کار ہو تو بہتر ہے۔"

"فی الحال میری سمجھ میں یہی طریقہ ہے۔ آپ اس پر عمل کریں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ دماغی طور پر صحت مند ہو جائیں گی۔ صرف اتنا ہی نہیں' جب آپ ان کی خواہش کا احترام کریں گے' تو وہ بھی آپ کی خواہش کا احترام کریں گی۔ پھر آپ کی زبان سے بیٹے کا لفظ سن کر جنون میں مبتلا نہیں ہوں گی۔ نہ ہی آپ پر دورہ پڑے گا۔ آپ میرے مشورے پر عمل کر کے تو دیکھیے۔"

اس نے عمل کرنے کا وعدہ کیا اور چلا آیا لیکن وہ عمل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بات محض بیٹا یا بیٹی کی نہیں تھی۔ اگر وہ بیٹے کی تمنا کرتا تھا اور قدرت کی طرف سے بیٹی ہو جاتی تو وہ زیادہ سے زیادہ بیوی کو غصہ دکھاتا لیکن بیٹی کو قبول کر لیتا جیسا کہ پہلی بیوی سے اس نے ایک بیٹی کو قبول کیا تھا لیکن وہ اپنے سابقہ تجربات سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اس کے آٹھ عدد بیٹے اس کی دھونس اور طلاق کی دھمکی کے تجربات کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ پھر اس کا دل کہتا تھا کہ زیبی کو دورہ نہیں پڑتا۔ چالاکی دکھا رہی ہے' مکاری کر رہی ہے۔ اگر وہ اسے اسی طرح چھوڑ دے گا' اپنے پاس نہیں بلائے گا' اس کے اخراجات میں کمی کرتا رہے گا تو وہ مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دے گی۔

☆=========☆=========☆

ایک روز صبح بیدار ہوتے ہی اس کی دائیں آنکھ پھڑکنے لگی وہ خوش ہو گیا۔ ضرور اسے کہیں سے کوئی خوشخبری ملنے والی تھی۔ یہ بھی اس کے تجربات میں شامل تھا۔ ایک بار دائیں آنکھ پھڑکی تو اسے سوسائٹی میں ایک ہزار گز کا پلاٹ سستے داموں مل گیا۔ پھر آنکھ پھڑکی تو ایک ہی دن میں تین بچوں کا باپ بن گیا تھا۔ وہ بارہا آزما چکا تھا۔ جب بھی دائیں آنکھ پھڑکتی تھی' ضرور اس کے لیے کوئی اچھی بات ہوتی تھی۔ وہ پھر خوشی سے گنگناتا ہوا اردو اخبار لے کر باتھ روم چلا گیا۔ وہاں سے واپس آ کر اس نے بہترین لباس پہنا۔ ایک اچھا سا پرفیوم لباس پر اسپرے کیا پھر نیچے آ کر اس نے گیراج اور دفتر کھولا۔ اس کا دل کہتا تھا' آج کسی کار کا بہت اچھا سودا ہو گا یا پھر زیبی معافی مانگنے آئے گی۔ یا پھر ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور ہو گی۔ وہ اسی انتظار میں دن کے ایک بجے تک مصروف رہا۔ پھر اسے بھوک لگنے لگی۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک خوشبو کا ایک جھونکا دفتر میں آیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک بہت ہی حسین

عورت کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑا شریف آدمی تھا۔ بیوی کے علاوہ کسی عورت کو نظر بھر کے نہیں دیکھتا تھا لیکن اس وقت وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ آگے بڑھ کر بولی۔ ”میں ادھر آپ کے گیراج میں گئی تھی میری کار میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ لڑکے کہتے ہیں، جب تک آپ حکم نہیں دیں گے، کوئی ادھر سڑک پر جاکر اسے چیک نہیں کرے گا۔“

وہ فوراً ہی اٹھ کر بولا۔ ”آیئے، میں چل کر دیکھتا ہوں۔“

وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اسے بہت اچھا لگا۔ یوں لگا جیسے وہ اسی کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے اس دنیا میں آئی ہے۔ پہلی بار اس کا دل زبیی سے ہٹ کر اس عورت کی طرف مائل ہونے لگا۔

اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہو گی۔ چہرے پر سنجیدگی اور وقار تھا۔ وہ اس سے متاثر ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایک مرد کی حیثیت سے اسے کس طرح متاثر کرے۔ یہ بات اس کی مڈل پاس سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ کار کے پاس پہنچا اور اس کے بونٹ کو کھول کر چیک کرنے لگا تو پتا چلا، بالکل معمولی سی خرابی ہے۔ بیٹری کی ایک تار ذرا ڈھیلی ہو گئی تھی اس لیے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ عورت اس معاملے میں اناڑی تھی۔ اس ذرا سی خرابی کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ ماسٹر عبداللہ کو حاجی صاحب کی بات یاد رہتی تھی۔ رزقِ حلال میں برکت ہے کبھی گاہک کو دھوکا نہ دو۔

مگر اس بار اس کی نیت کچھ ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اس نے سوچا، میں فاضل کمائی کے لیے بے ایمانی نہیں کروں گا لیکن اسے ایک بار اور دیکھنے کے لیے کچھ جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ وہ کار کے اندر سے اِدھر اُدھر جانے کیا کچھ ٹٹولتا رہا۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر عبداللہ بھی اسے دیکھنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

ماسٹر عبداللہ نے بونٹ گراتے ہوئے کہا۔ ”نظر لگ گئی ہے۔“

”جی کیا کہا، آپ نے۔“

”میرا مطلب ہے، آپ کی گاڑی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے چیز اچھی ہو تو بڑی جلدی نظر لگ جاتی ہے۔“

وہ مسکرانے لگی۔ ”آپ میکینک ہیں یا نظر اتارنے والے کوئی پیر صاحب؟“

”پیر کسی بزرگ کو کہتے ہیں۔ کیا میں آپ کو بوڑھا نظر آرہا ہوں؟“ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ شاید وہ اس کی عمر پر طنز کر رہی ہے۔

”بوڑھے تو نہیں ہیں لیکن عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں لفظوں کے ہیر پھیر سے اپنے دل کی بات کہنے کا ہنر آجاتا ہے۔ اب آپ کام کی بات کریں۔“

اس نے کہا۔ ”اس میں کئی خرابیاں ہیں۔ بیٹری کے تاروں کو اطمینان سے چیک کرنا ہو گا۔ پلگ اور پوائنٹ میں کچرا آگیا ہے اگر اسے فوری طور پر درست کر کے چلانے کی کوشش کی جائے تو گاڑی چلتے چلتے جھٹکے کھائے گی۔ کلچ میں تیل بھی جمع ہو گیا ہے۔“

”دیکھیے، میں یہ ٹیکنکل باتیں نہیں سمجھتی ہوں۔ آپ یہ بتائیں کتنی دیر میں یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”میں گیراج کے لڑکوں سے کہتا ہوں، وہ گاڑی کو دھکا دے کر لے جائیں۔ شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔“

”اوہ، تو میں گاڑی یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتی میری باجی ناراض ہوں گی۔“

”کیوں ناراض ہوں گی؟“

”وہ کہتی ہیں، فریج، ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ میں کوئی خرابی ہو تو میکینک کو گھر بلا کر ان چیزوں کو درست کرانا چاہیے۔ اگر کسی مکینک کے بھروسے پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بے ایمانی کرتے ہیں۔“

”کیا میں بے ایمان نظر آتا ہوں؟“

”دیکھیے، یہ میں نہیں کہتی۔ میری باجی کہتی ہیں کہ گاڑی کے پرزے اور مرد کی نیت بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”آپ اپنی باجی کی نصیحت پر عمل کریں گی تو یہ گاڑی یہیں سڑک کے کنارے کھڑی رہے گی۔ نہ گیراج میں جائے گی نہ آپ کے گھر پہنچ سکے گی۔“

”میں یہ بھی نہیں چاہتی۔ یہاں اگر بس یا ٹرک نے ٹکر ماری تو پلک جھپکتے ہی یہ سیکنڈ ہینڈ ہو جائے گی۔“

”پھر کیا ارادہ ہے؟“

اس نے ماسٹر عبداللہ کو دیکھا۔ پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی نیت پر بھروسہ کرنا ہی ہو گا لیکن میری ایک پرابلم ہے۔ میں گھر کیسے جاؤں۔ کیا آپ کسی لڑکے کو بھیج کر میرے لیے ٹیکسی منگوا سکتے ہیں۔“

”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

”عرشی سینما کے سامنے ہی ہماری کوٹھی ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے عرشی سینما کے نیچے جو ریستوران ہے‘ وہیں جاتا ہوں چلئے میں آپ کو وہاں چھوڑ دوں گا۔“

وہ اس کے ساتھ گیراج میں واپس آیا۔ وہاں اپنے بیٹے راجو کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ”ان صاحبہ کی گاڑی میں معمولی سی خرابی ہے۔ اسے دور کر کے گیراج کے سامنے لا کر کھڑی کر دو۔ یہ شام کسی وقت آ کر لے جائیں گی۔“

پھر وہ اپنی کار کے پاس آیا۔ اس کے اگلے دروازے کو کھولتے ہوئے بولا۔ ”تشریف رکھیے۔“

اس عورت نے کار کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا مجھے آپ کے برابر بیٹھ کر اپنے گھر تک جانا چاہیے۔“

”اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اگر آپ پیچھے بیٹھیں گی تو میں آپ کا ڈرائیور سمجھا جاؤں گا۔ آگے بیٹھیں گی تو ہم زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے کزن معلوم ہوں گے۔“

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے دروازے کو بند کیا۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی۔ کار کو اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈال دیا۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ماسٹر عبداللہ کوئی بات چھیڑنے کے لیے موضوع تلاش کرنے لگا۔ جب کوئی سمجھ میں نہ آئی تو اس نے پوچھا۔ ”آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“

”آپ کیوں پوچھنا چاہتے ہیں؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے گیراج کے لڑکوں کو آپ کے متعلق تفصیل سے بتایا نہیں ہے۔ اب جا کر بتاؤں گا کہ فلاں صاحبہ آئیں گی تو گاڑی ان کے حوالے کر دینا۔“

”اوہ اچھا‘ میرا نام واجدہ ہے۔ اب آپ پوچھیں گے‘ میری شادی ہوئی ہے۔ کتنے بچے ہیں؟“

”پوچھنے سے پہلے ہی آپ جواب دے دیجئے۔“

”میری شادی ہوئی تھی۔ کوئی بچہ نہیں ہے۔ چار سال کے بعد میں بیوہ ہو گئی۔“

”کمال ہے۔“

”آپ ہوش میں تو ہیں۔ کیا بیوہ ہونا کمال کی بات ہے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں یہ حیرانی ظاہر کر رہا ہوں کہ آپ کسی پہلو سے بھی شادی شدہ نہیں لگتیں۔ کجا یہ کہ آپ چار برس تک سہاگن رہیں۔ آپ کو دیکھ کر یقین نہیں آتا۔“

”میں یہ سن کر خوش نہیں ہوئی کہ بیوہ ہونے کے باوجود کنواری لگتی ہوں۔ میری عمر اب تیس برس ہو چکی ہے۔“

”میں آپ سے عمر میں آٹھ برس بڑا ہوں۔“

”میں نے آپ سے عمر تو نہیں پوچھی۔“

”میں نے بھی آپ کی عمر نہیں پوچھی تھی۔ دراصل انسان عمر سے نہیں خیالات سے بوڑھا ہوتا ہے۔ آپ کی صحت‘ آپ کی گفتگو کا انداز‘ آپ کے چہرے کی شادابی بتا رہی ہے کہ آپ کے خیالات آپ کی عمر سے بہت کم ہیں۔“

”آپ ہوٹل میں کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ کیا آپ کے گھر میں کوئی نہیں ہے؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”میں تنہا ہوں۔“

”کیا اب تک شادی نہیں کی؟“

”کی ہے۔ پہلے ایک شادی کی۔ اس بیوی سے کچھ بچے ہیں لیکن وہ میری ہم مزاج نہیں ہے۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ وہ بالکل جاہل ہے۔ میرے ساتھ کہیں جاتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔ میرے دوستوں سے بات نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں نے اسے ناظم آباد میں رکھا ہے۔ اس کے اخراجات پورے کرتا رہتا ہوں۔ مہینے دو مہینے میں کبھی جا کر ملاقات بھی کر لیتا ہوں۔ دیکھنے میں وہ میری بیوی نہیں اماں معلوم ہوتی ہے۔“

وہ چپ رہی اس نے کہا۔ ”پھر میں نے دوسری شادی کی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ میری بیوی دماغی مریضہ ہے۔ میں نے اس کا بتیرا علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔“

”طلاق کیوں دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے طلاق دینے سے وہ صحت مند ہو جائے

گی؟"

"نہیں ہو گی لیکن میں اسے بے آسرا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے واجبات ادا کر دوں گا اور آئندہ بھی کبھی علاج وغیرہ کے سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو ضرور مدد کروں گا لیکن ایک دماغی مریضہ میرے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ میرے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتی۔ میرے لیے کھانا بھی نہیں پکا سکتی۔ جب میری زندگی میں کسی کام نہیں آسکتی تو پھر شریکِ حیات تو نہ ہوئی۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچنے کے انداز میں ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ اسے طلاق نہ دیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔"

"اگر میں آپ کے مشورے پر عمل کروں تو تیسری شادی نہیں کر سکوں گا۔ جہاں کہیں رشتے کی بات کروں گا وہاں یہی کہا جائے گا کہ میں پہلے ہی دو بیویوں کا شوہر ہوں اور میں دو بیویوں کا الزام اپنے سر سے ہٹانا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھتی ہوں' اگر آپ کہیں رشتہ مانگنے جائیں اور انہیں اپنی دوسری بیوی کے حالات تفصیل سے بتائیں تو وہ آپ کی تعریف کریں گے۔ آپ کی انسانی ہمدردی کو سمجھتے ہوئے یہی کہیں گے کہ آپ مجبوری کی حالت میں تیسری شادی کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ لڑکی دینے سے انکار نہیں کریں گے۔"

"کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟"

"ہاں' میرا دل یہی کہتا ہے۔"

"کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گی؟"

وہ چونک کر بولی۔ "بھلا میں کیا مدد کر سکتی ہوں۔ کیا آپ نے تیسری شادی کے لیے کوئی گھر دیکھا ہے؟" وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ دیکھیے وہ جو سبز رنگ کا گیٹ ہے وہی ہماری کوٹھی ہے۔"

اس نے گاڑی اس کوٹھی کے سامنے روک دی۔ پھر کہا۔ "میں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ آج شام کو بات کرنے آؤں گا۔"

وہ کار سے اترتے ہوئے بولی۔ "آؤں گا کا مطلب کیا ہوا۔ کیا وہ گھر یہیں کہیں ہے؟"

"جی ہاں' کیا آپ موجود رہیں گی۔"

"میں بھلا کیسے موجود رہوں گی۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔"

"آپ یہ بتائیں' آپ کے گھر میں اور کون کون ہیں۔ کیا یہ کوٹھی آپ کے مرحوم شوہر کی ہے؟"

"نہیں' یہ میرے دولہا بھائی کی کوٹھی ہے۔ میں اپنی باجی کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"یہی دونوں آپ کے سرپرست ہیں؟"

"جی ہاں' مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

اس نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ میں ہی آپ کی گاڑی شام کو یہاں پہنچا دوں؟"

"اس سے اچھی اور بات کیا ہو سکتی ہے لیکن آپ کو زحمت ہو گی۔"

"زحمت اٹھانے سے کبھی کبھی رحمت حاصل ہوتی ہے۔ اچھا سو فار۔ شام کو ملاقات ہو گی۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے حیرانی سے سوچتا ہوا چھوڑ کر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ اب اس کے اندر ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا' کیا کرے؟ کیا آج ہی اس کا رشتہ مانگنے اس کے گھر پہنچ جائے؟ جب وہ زبان سے کہہ چکا ہے تو گویا دل سے کہہ چکا ہے۔ دل اس پر بری طرح مرمٹا ہے۔ کیا انداز ہے۔ کیا سج دھج ہے کیا رعنائی ہے۔ دیکھتے ہی دل کو کھینچ لیتی ہے۔ جب وہ بہن اور بہنوئی کے ہاں رہتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ بیوگی کے دن وہیں گزار رہی ہے۔ یقیناً اپنی بہن اور بہنوئی پر بوجھ ہو گی۔ اگر رشتہ مانگا جائے تو شاید منظور کر لیا جائے۔

ہوٹل میں کھانے کے دوران خیال آیا' پہلے واجدہ کو اور اس کے خاندان والوں کو سمجھنا چاہیے۔ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ پھر وہ بھی آنکھ بند کر کے یہ رشتہ منظور نہیں کریں گے اس کے متعلق بھی چھان بین کریں گے۔ اس نے سوچا' چلو اچھا ہے جب تک دونوں طرف سے معلومات حاصل کی جائیں گی' اس وقت تک وہ واجدہ کو اور اچھی طرح سمجھ لے گا۔

اب زیبی بوجھ لگ رہی تھی۔ وہ کسی کام کی نہیں تھی۔ نہ اس کے گھر آنا چاہتی تھی۔ نہ اس کی تنہائی دور کر سکتی تھی اور نہ ہی اس میں اتنی کشش تھی کہ وہ نہ ہوتی تو اس کی تصویر سے دل بہلایا جاتا۔ تصویر تو واجدہ کی تھی جو دل کی دیوار پر آویزاں ہو گئی

تھی۔ اسے بہلا بھی رہی تھی۔ بلا بھی رہی تھی۔

وہ شام کو واجدہ کی گاڑی اس کے گھر پہنچانا چاہتا تھا۔ دفتر سے نکلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔" دوسری طرف سے زیبی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "بے بی بیمار ہے۔"

"کون بے بی؟"

"وہی ہماری بے بی۔"

"تم اسے بے بی کیوں کہتی ہو۔ وہ بیٹی نہیں ہے۔"

"بیٹی ہو یا بیٹا' ہے تو ہمارا۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "آخر تم نے کس لیے فون کیا ہے؟"

"میں کہہ تو رہی ہوں۔ وہ بہت سخت بیمار ہے۔ اس کے علاج کے لیے کچھ پیسے چاہئیں۔"

"رقم پہنچ جائے گی اور کچھ؟"

"ہاں' میں سوچ رہی ہوں' اس طرح زندگی کیسے گزرے گی؟"

"یہ فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔"

"میں نے بہت سوچا۔ اسی نتیجے پر پہنچ رہی ہوں کہ آپ کے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ میں کب تک آپ کی محتاج رہوں گی۔"

"یہ تمہارا دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ اس فیصلے کو آخری صورت دو۔ میں تیار ہوں۔ تمہاری مہر کی رقم دس ہزار روپے کل ہی پہنچا سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں پہلے دس ہزار ادا کر دوں گا لیکن تم یہ تحریر دو گی کہ تم نے خود طلاق طلب کی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے پہل نہیں کی تھی۔"

"میں سوچوں گی۔"

"آج رات بھر سوچ لو۔ کل میں دس ہزار لے کر آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ایک گہری اطمینان کی سانس لی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل اور دماغ سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اس نے بارہا آزمایا تھا۔ جب بھی اس کی دائیں آنکھ پھڑکتی تھی' ضرور خوشخبری ملتی تھی۔ آج تو ایک ساتھ دو دو خوشیاں مل رہی تھیں۔

ایک طرف سے واجدہ اس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی' دوسری طرف سے زیبی باہر جاتی نظر آ رہی تھی۔

☆=========☆=========☆

وہ گاڑی لے کر اسی سبز گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ گاڑی کا ہارن بجایا تو ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے آ کر دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی کو ڈرائیو کرتا ہوا احاطے کے اندر آ گیا۔ پھر کار سے اتر کر بولا۔ "میں ماسٹر عبداللہ ہوں۔ یہ گاڑی محترمہ واجدہ صاحبہ میرے گیراج میں چھوڑ کر گئی تھیں۔ آپ کی تعریف۔"

اس شخص نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے سرفراز علی کہتے ہیں۔ میں واجدہ کا بہنوئی ہوں۔ آیئے' تشریف لایئے۔"

اسے ایک بہت ہی پُر تکلف ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ واجدہ کی بڑی بہن بھی آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "گاڑی میں کیا خرابی تھی۔ کیا زیادہ بل بنا ہے۔"

ماسٹر عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں ہے کہ کیا خرابی تھی اور کیا کچھ درست کیا گیا ہے۔ میرے کاریگروں نے اسے ٹھیک کر دیا ہے۔ میں بغیر بل کے آیا ہوں۔"

واجدہ کی بہن بیگم سرفراز نے پوچھا۔ "یعنی آپ رسید دے کر بل وصول نہیں کرتے۔ زبانی حساب کرتے ہیں۔"

"جی نہیں' میں زبانی حساب کرنے بھی نہیں آیا ہوں۔ میرے کاریگروں نے بتایا کہ معمولی سی خرابی تھی۔ وہ دور کر دی ہے۔ دراصل میں بل وصول کرنے نہیں بلکہ کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں۔"

سرفراز علی نے کہا۔ "ہاں' فرمایئے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں نے اپنا نام بتایا ہے۔ آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ میرا کاروبار کتنا پھیلا ہوا ہے۔ میں ایک خوش حال آدمی ہوں۔ میری پہلی بیوی سے نو بچے ہیں۔ وہ بیوی میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے میرے ماحول میں میرا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چونکہ پڑھی لکھی نہیں ہے' اس لیے میرے دوستوں کے سامنے آنے سے ہچکچاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تقریباً ڈھائی برس سے میرا اس کا ساتھ نہیں ہے۔ میں نے اس کے لیے الگ مکان بنوایا ہے۔ اس کے اور تمام بچوں کے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ میری بیوی بہت بوڑھی اور کمزور لگتی

ہے۔ جاہل بھی ہے۔ غرض ہمارا ملن برائے نام ہے۔"

"اچھا تو پھر؟"

"میں بالکل تنہا ہو گیا۔ مجھے ایک شریکِ حیات کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک جگہ شادی کی بات چلائی۔ پھر شادی ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے پتا چلا کہ میری دوسری بیوی دماغی مریضہ ہے۔ میرے پاس اس کے علاج کے سلسلے کے کاغذات موجود ہیں۔ بہرحال میں نے تقریباً دو برس تک اس سے نباہ کیا لیکن وہ نہ تو میرے ساتھ رہتی ہے۔ نہ میری کوئی خدمت کر سکتی ہے۔ نہ میرے معاملات میں کبھی کوئی دلچسپی لیتی ہے۔ اب میں اس قدر تنہا ہوں کہ ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں اور رات کو اپنے فلیٹ میں جا کر سوتا ہوں۔"

"آپ کے حالات افسوس ناک ہیں۔ ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔ کیا آپ کی وہ دوسری بیوی........؟"

اس نے بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔ "جی ہاں' فی الحال تو وہ میری بیوی ہے۔ لیکن آج ہی دوپہر کو اس نے خود مجھ سے فون پر گفتگو کی تھی۔ وہ میرے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا' دیکھو' اگر میں تمہیں چھوڑ دوں گا یا طلاق دوں گا تو دنیا مجھے بدنام کرے گی۔ میں تمہاری مہر کی رقم جب چاہو دے سکتا ہوں لیکن مجھے الزام سے بچانے کے لیے اپنا تحریری بیان دے دو کہ تم اپنی مرضی سے میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

سرفراز علی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' اگر آپ ایک اچھی شریکِ حیات کی تلاش میں ہوں تو آپ کی یہ کوشش جائز ہے۔"

"جی ہاں' میں یہی عرض کر رہا ہوں۔ مجھے ایک اچھی شریکِ حیات کی تلاش ہے۔ دیکھیے جس گھر میں بیری ہوتی ہے' وہاں پتھر آیا ہی کرتے ہیں۔ یہ بہت پرانی کہاوت ہے۔ اسی کہاوت کا سہارا لے کر میں آپ سے کہنے آیا ہوں کہ آج میں نے آپ کی سالی کو دیکھا اور پسند کیا اگر آپ کو یہ بات بری نہ لگے' تو آپ میرے متعلق پوری طرح چھان بین کر لیں۔ جب تک آپ میری طرف سے مطمئن نہیں ہوں گے' میں آپ کے جواب کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

سرفراز علی اور اس کی بیگم ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں ہی میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ اسی وقت واجدہ چائے کی ٹرے لے

کر آ گئی۔ صوفوں کی درمیانی میز پر چائے کی ٹرے رکھنے کے بعد آنچل سنبھالتے ہوئے واپس چلی گئی۔ شاید اس نے یہ باتیں سن لی تھیں۔ مشرقی لڑکی وہاں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اس کی بڑی بہن نے ایک پیالی چائے انڈیلی پھر ماسٹر عبداللہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ چائے پییں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

وہ اٹھ گئی اور جاتے جاتے اپنے شوہر کو آنے کا اشارہ کیا۔ سعادت مند شوہر بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا چائے پیتا رہا اور سوچتا رہا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد ہی اس دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہاں واجدہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟"

"کیا میں نے غلط کیا ہے؟"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اس وقت میرے متعلق باتیں کر رہے تھے اور میرا رشتہ مانگنے یہاں آئیں گے۔"

"اگر معلوم ہوتا تو کیا انکار کر دیتیں یا اب انکار کرنے والی ہیں۔"

"دیکھیے' میں نے سوچا تھا کہ زندگی یونہی گزار دوں گی۔ میرے دل میں کوئی خواہش' کوئی ارمان نہیں ہے۔ میں وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی ہوں۔"

"جب آدمی وقت کے بعد بھی جوان رہ سکتا ہے تو وقت سے پہلے بوڑھے خیالات سے نجات حاصل کرنا کوئی ناممکن بات تو نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی۔ میں بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ میں نے آج سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا اور آج کے بعد تمہارے سوا کسی کی طرف نہیں دیکھوں گا۔"

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی بڑی بہن اور بہنوئی کمرے میں آ گئے۔ اس کے بہنوئی نے ایک لیٹر پیڈ اور قلم ماسٹر عبداللہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ اس میں اپنی پہلی اور دوسری بیوی کے پتے لکھ دیں۔ ہمیں آپ کے رہائشی اور کاروباری پتے بھی چاہئیں۔ ہم پہلے آپ کے متعلق معلومات حاصل کریں گے' اس کے بعد کوئی بات ہو سکتی ہے۔"

ماسٹر عبداللہ نے تمام پتے لکھ دیے۔ وہ دوسرے دن دس ہزار روپے لے کر زیبی کے پاس گیا۔ اس نے پہلے ہی ایک کاغذ میں اپنا تحریری بیان لکھ دیا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے طلاق حاصل کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ مزاجاً اپنے شوہر سے مختلف ہے اور اس کے ساتھ

زندگی نہیں گزار سکتی۔

دونوں میاں بیوی کی ملاقات ایک بند کمرے میں ہوئی۔ اس نے مہر کے دس ہزار روپے اس کے سامنے رکھ دیے۔ زیبی نے سر جھکا کر کہا۔ "خدا گواہ ہے۔ مجھے دولت کا لالچ نہیں ہے اور یہ دس ہزار کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ صرف آپ کی بچی کے لیے یہ رقم لے رہی ہوں تاکہ جب تک میرا کوئی سہارا نہ ہو' اس وقت تک بچی کو کسی طرح کی کمی نہ ہو۔"

ماسٹر عبداللہ نے اس کا تحریری بیان لے کر پڑھا۔ پھر کہا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔ ہم دونوں کی بھلائی اسی میں تھی کہ ایسا ہی کوئی فیصلہ ہو جائے۔ ویسے جب تک تم دوسری شادی نہ کرو' اس وقت تک بچی کے اخراجات کے لیے ایک ہزار روپے ماہانہ دیتا رہوں گا۔"

"آپ سے ایک درخواست ہے۔ آپ یہ لکھ دیں کہ میری بچی کو مجھ سے کبھی نہیں لیں گے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جس بچی کو میں نے پیدا ہونے کے بعد دیکھا نہیں' اس کی تمنا کیا کروں گا' مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے تمہارے اس تحریری بیان کے مطابق جب ہم قانونی طور پر طلاق حاصل کریں گے تو اس وقت میں اس بچی کو تمہارے حوالے کر دوں گا اور اس سے دستبردار ہونے کی تحریر لکھ دوں گا۔"

زیبی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"اب کیوں روتی ہو۔ کیا اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں' طلاق حاصل کرنے کا فیصلہ میں نے کیا ہے۔ میں اس پر نہیں پچھتا رہی ہوں' مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ جس بچی کو میں آپ کی امانت سمجھ کر محبت سے پالتی رہی' اسے آپ نے کبھی ایک نظر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور اسے یوں میری جھولی میں ڈال کر جا رہے ہیں جیسے میں اسے کہیں سے مانگ کر لائی تھی۔ میرے اور آپ کے کسی ازدواجی رشتے کا حوالہ اس بیٹی کے ساتھ نہیں ہے۔ جائیے۔ چلے جائیے۔ میں نے آپ جیسا خود غرض آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا اور شاید نہ دیکھ سکوں۔"

وہ جانے لگا۔ ابھی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ زیبی نے ایک دم سے بپھر کر کہا۔

"ٹھہریے۔"

وہ اس کے تیور دیکھ کر حیرانی سے پلٹ گیا۔ پھر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

زیبی کا چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے تھر تھر کانپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ میں نے آپ کو بہت موقع دیا کہ آپ اسے اپنی بیٹی تسلیم کر لیں لیکن آپ نے انکار کیا۔ ٹھیک ہے' جائیے۔ جب عدالت میں طلاق ہو گی تو اس وقت آپ کس حوالے سے اس بیٹی کو میری جھولی میں ڈالیں گے۔ ماسٹر عبداللہ کو بھری عدالت میں یہ کہنا پڑے گا کہ وہ آپ کی اولاد ہے۔ اور آپ اسے اپنے نام کے ساتھ میرے حوالے کر رہے ہیں اور وہ جہاں کہیں رہے' باپ کا نام اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے آپ کبھی بھی انکار نہیں کر سکیں گے۔ جائیے' بس چلے جائیے۔"

وہ چلا آیا۔ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ لاکھ انکار کے باوجود عدالت میں تو کہنا ہو گا کہ وہ بچہ جو نہ لڑکا ہے نہ لڑکی ہے اس کی اولاد ہے اور وہ اسے ہمیشہ کے لیے زیبی کے حوالے کر رہا ہے۔ اس بات نے اسے ذہنی طور پر الجھا دیا۔ اس نے میٹرنٹی ہوم میں ہی اس بچے کو اپنی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ اپنے دوستوں اور رشتے داروں میں کہہ دیا تھا کہ اولاد ہوئی تھی' وہ مر گئی۔ اب بھری عدالت میں اپنی بات کی تردید کرنی ہو گی جو سچ ہے وہی کہنا ہو گا۔

جب نئی نئی مسرتیں حاصل ہو رہی ہوں تو ایک پریشان کن مسئلہ زیادہ پریشانی کا باعث نہیں بنتا۔ واجدہ اس کی زندگی میں آنے والی تھی۔ وہ زیبی کے طلاق کے معاملے کو جلد از جلد نمٹا لینا چاہتا تھا۔ ادھر واجدہ کا بہنوئی سرفراز علی اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں کافی دن لگا رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

اونٹ اسی کروٹ بیٹھتا ہے' جدھر آسانی سے چارے پر منہ مار سکے اور جہاں دولت ہوتی ہے وہاں چارہ ڈالنا آسان ہوتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی صابرہ اپنے شوہر کے خلاف کوئی بیان نہیں دے سکتی تھی۔ سرفراز علی نے جو معلومات حاصل کیں' وہ سب ماسٹر عبداللہ کی حمایت میں تھیں۔ کیونکہ صابرہ کو کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔ وہ اچھا کھاتی پیتی تھی۔ اپنا مکان تھا اور بیٹے جوان ہو رہے تھے شوہر نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ کاروبار اپنے بیٹوں کے ہی حوالے کرے گا۔"

سرفراز علی نے زیبی کے والدین سے ماسٹر عبداللہ کے متعلق سوالات کیے۔ انہوں

نے کہا۔ "اب ہم کسی کی برائی کیا کریں۔ ہماری بیٹی کے نصیب ہی ایسے تھے۔ ہاں' اتنا ضرور ہے کہ وہ آدمی ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ کھانے پینے' پہننے' اوڑھنے' گھومنے پھرنے کے سلسلے میں کبھی روک ٹوک نہیں کرتا تھا۔ ہماری بیٹی کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ بس اسے بیٹوں کا باپ بنتے رہنے کا خبط ہے۔ بیٹی بالکل ہی پسند نہیں کرتا۔ اس ایک جہالت نے میری بیٹی کا گھر برباد کر دیا۔"

"کیا آپ کی بیٹی دماغی مریضہ تھی؟"

"شادی کے بعد ہوئی۔ اگر ماسٹر عبداللہ یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے دماغی مریضہ تھی تو یہ غلط ہے۔"

سرفراز علی نے پھر ماسٹر عبداللہ سے ملاقات کی۔ ایک ریستوران میں انہوں نے رات کا کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران سرفراز علی نے کہا۔ "تمہاری پہلی بیوی نے مکمل طور پر تمہاری حمایت میں بیان دیا ہے۔ دوسری بیوی کے والدین نے کچھ حمایت کی' کچھ اختلافات کیا۔ میں سمجھتا ہوں' ان کی بیٹی کو تمہاری طرف سے طلاق ہو رہی ہے' اس لیے ان کے لہجے میں اور ان کے بیان میں کچھ تلخی تھی۔"

ماسٹر عبداللہ نے پوچھا۔ "اب میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہم واجدہ کو کسی ایسے شخص کے ساتھ بیاہنا چاہتے تھے جو اس کے مزاج کو سمجھے۔ اسے خوش رکھے اور خوش رکھنے کے لیے اس کے پاس اچھا کاروبار اور اچھی آمدنی ہو۔ یہ سب کچھ تمہارے پاس ہے۔ اب تم کس حد تک واجدہ کے مزاج کو سمجھو گے یہ ہم نہیں جانتے۔ ویسے اگر تمہاری یہ بات درست ہے کہ تمہیں بیٹوں کا خبط ہے۔ بیٹیوں سے تم الرجک ہو تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے سرفراز بھائی! ہر شخص بیٹے کی تمنا کرتا ہے۔ میں بھی تمنا کرتا ہوں۔ اگر میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ مجھے بیٹا چاہیے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زبردستی کہیں سے بیٹا لا کر مجھے اس کا باپ بنا دے۔ بھئی یہ تو قدرت کے کھیل ہیں۔ اگر بیٹی ہو جائے تو کیا میں اس سے انکار کر سکتا ہوں۔ آپ کے سامنے ثبوت موجود ہے۔ میری پہلی بیوی کے ہاں بھی ایک بیٹی ہے کیا میں اسے اپنی بیٹی نہیں کہتا۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں بہرحال اب یہ طے ہونا باقی ہے کہ واجدہ کے مستقبل کی ضمانت کیا ہو گی؟"

"ہمارے مذہب کے مطابق جب چار آدمیوں میں نکاح پڑھایا جاتا ہے تو وہی نکاح ایک عورت کے مستقبل کی ضمانت ہوتا ہے۔ پھر مہر کی ایک معقول رقم ہوتی ہے جو اس عورت کو شوہر سے الگ ہونے کے بعد بڑی حد تک دوسروں کی محتاجی سے محفوظ رکھتی ہے۔"

"مہر کی رقم سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کے آٹھ عدد بیٹے پہلے سے ہیں۔ ایک بیٹی ہے۔ دوسری بیوی سے بھی ایک بیٹی ہے۔ آپ کی اولادیں اتنی ہیں کہ آپ کی دولت اور جائیداد کو تقسیم کیا جائے تو شاید تیسری بیوی کے حصے میں کچھ نہ آئے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ جائیداد کا کچھ حصہ اور اپنی آمدنی کا کچھ حصہ میں واجدہ کے نام لکھوں تو میں ایک شرط پر لکھنے کے لیے تیار ہوں۔"

"وہ شرط کیا ہے؟"

"میں ایک تحریری بیان دوں گا کہ واجدہ بیگم آخری سانس تک میری شریکِ حیات رہیں اور میرے ساتھ ایک بیوی کے رشتے کو پوری طرح نباہیں تو میری موت کے بعد وہ ایک فلیٹ اور پانچ لاکھ روپے نقد کی حق دار ہو گی۔"

سرفراز علی نے تائید میں سرہلا کر کہا۔ "ہاں' یہ معقول بات ہے۔ مجھے منظور ہے۔"

"تو پھر میں شادی کی تاریخ مقرر کرنے آپ کے ہاں آؤں؟"

"ابھی نہیں۔ پہلے آپ دوسری بیوی کو طلاق دینے کے معاملے سے نمٹ جائیں۔ جب عدالت سے آپ کو کاغذات مل جائیں گے تو پھر تاریخ مقرر ہو جائے گی۔ دیکھیے میں صاف بات کرنے والا آدمی ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب طلاق ہو رہی ہے تو ہو ہی جائے تاکہ واجدہ پر دو سوکنیں نہ رہیں۔"

معاملات طے ہو گئے۔ جس چیز کی تمنا ہو اور وہ مل جائے تو اس تمنا میں زیادہ شدت نہیں رہتی۔ وہ کمزور پڑ جاتی ہے اور جو دیر سے ملے' ترسا ترسا کر ملے اور خوب انتظار کرائے تو اس کی چاہت میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ واجدہ کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ تین ماہ کے بعد کورٹ کے ذریعے طلاق کا معاملہ نمٹ گیا۔ دوسری بیوی اس کی زندگی سے نکل گئی۔ پانچ ماہ کے بعد تیسری بیوی اس کی زندگی میں آ گئی۔

وہ واجدہ کو پا کر بہت خوش تھا کیونکہ وہ اس کی ہم مزاج تھی۔ جب اس نے ایک بیٹے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ خوش ہو کر بولی۔ "میری بھی تمنا ہے کہ میں پہلے ایک بیٹے کی ماں بنوں۔"

اس نے پوچھا۔ "پہلے شوہر سے تمہاری کوئی اولاد نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

شادی کے چند دن بعد واجدہ کی باجی نے پوچھا۔ "تم اپنے میاں کے ساتھ خوش تو ہو؟"

"ہاں باجی، بہت خوش ہوں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ زندہ دل ہیں اور کسی بات پر روک ٹوک نہیں کرتے۔ گھر میں اور گھر سے باہر مجھے پوری آزادی ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ فرصت کے اوقات میں، میں سوشل ورک میں مصروف رہتی ہوں۔ انہوں نے کسی بات پر اعتراض نہیں کیا ہے۔"

اس کی بہن اور بہنوئی مطمئن ہو گئے۔ دو دن اور گزر گئے۔ ایک رات وہ سو رہی تھی کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا گلا دبایا جا رہا ہے۔ اس نے فوراً ٹٹول کر دیکھا تو ماسٹر عبداللہ کا ہاتھ اس کی گردن پر تھا لیکن وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے ہاتھ کو ہٹایا تو وہ جاگ گیا۔ اس نے کہا۔ "اوں ہوں۔ پہلے بولو، بیٹا ہو گا۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "یہ کیا تک ہے؟"

"کیوں، کیا میں بیٹے کا مطالبہ نہیں کر سکتا؟"

"میں کوئی جاہل عورت نہیں ہوں۔ میں کسی مطالبے کو نہیں مانتی۔ باہمی رضامندی کو تسلیم کرتی ہوں۔ ہمارے درمیان یہ سمجھوتا ہو گیا ہے کہ بیٹا ہو گا۔ اگر مطالبے کی بات آئے گی تو ایک جاہل عورت اور ایک تعلیم یافتہ عورت کا فرق نمایاں ہو جائے گا۔"

وہ بھی اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "واجدہ! ایسے تیور میں بات نہ کرو۔ میں برداشت نہیں کرتا۔"

"اور میں بھی ایسی حرکتیں برداشت نہیں کرتی جو جاہل عورتوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ آئندہ آپ نے میری گردن پر ہاتھ رکھا تو میں........"

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "ہاں ہاں بولو، کیوں رک گئیں۔"

وہ نرم لہجے میں بولی۔ "میں ایک خوش گوار زندگی چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کو کئی

پہلو سے بہت بہتر پایا ہے۔ کیا ہم نرمی سے محبت سے کسی موضوع پر باتیں نہیں کر سکتے۔"

"ہاں، بے شک نرمی سے باتیں کر سکتے ہیں۔ چلو، جو ہوا سے بھول جاؤ اب آرام سے سو جاؤ۔"

ان کے درمیان صلح ہو گئی۔ ایک ماہ تک یہ صلح برقرار رہی۔ ایک صبح اس نے اخبار پڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا خبر ہے؟"

وہ غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ رک کر بولی۔ "اچھی خبر ہے آج اپوا کی میٹنگ میں شریک ہونے جا رہی ہوں۔"

"بھئی، میں تمہاری مصروفیات کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ خبر پوچھ رہا ہوں۔"

"اور کیا خبر ہو سکتی ہے؟"

"یہی کہ میں باپ کب بن رہا ہوں؟"

اس نے گھور کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "یہ خبر ہے، اگر آپ کو باپ بننے کا ارمان ہے تو آپ کو خوشخبری پوچھنا چاہیے۔"

"دیکھو واجدہ! جب بیٹا ہو گا تو میرے لیے خوشخبری ہو گی ورنہ نہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ بیٹی کو اتنا حقیر کیوں گردانتے ہیں۔ اتنا کیوں گراتے ہیں۔ کیا بیٹیاں نہیں ہوتیں۔ بیٹی نہ ہو، عورت نہ ہو تو نسل کیسے بڑھے۔"

"بھئی صبح سویرے بحث نہ کرو۔ کوئی خبر ہو تو سناؤ ورنہ خاموش رہو۔"

وہ پاؤں پٹختے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔ کچھ دنوں بعد ایک صبح عبداللہ کی آنکھ کھلی تو واجدہ کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر آواز دینا چاہتا تھا۔ اسی وقت باتھ روم سے ایسی آواز آئی جیسے واجدہ کو ابکائیاں سی ہو رہی ہوں۔ وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔ فوراً ہی تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر اسٹور روم میں پہنچا۔ وہاں اس کے آٹھ بیٹوں کی وہی بڑی بڑی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جو زیبی کے وقت لگائی گئی تھیں۔ وہ انہیں نکال کر پھر اپنے بیڈ روم کی دیواروں پر لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد واجدہ باتھ روم سے باہر آئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ ماسٹر عبداللہ نے اسے سہارا دے کر ایک ایزی چیئر پر بٹھایا۔ پھر پوچھا۔ "تمہارے کچھ پینے کے لیے لاؤں۔"

"نہیں، مجھے متلی ہو رہی ہے۔"

"لیمن اسکوائش پیو گی؟"

"نہیں، میں ابھی کچھ کھانا پینا نہیں چاہتی۔"

وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی گہری گہری سانسیں لیتی رہی پھر ذرا حالت سنبھلی تو وہ نیم دراز ہونے کے لیے کرسی کی پشت سے ٹک گئی۔ اسی وقت دیوار پر نظر پڑی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کس کی تصویریں ہیں؟"

"یہ میرے آٹھ بیٹوں کی تصویریں ہیں۔ میں نے چاروں طرف لگا دی ہیں۔ اب تم انہیں دیکھتی رہو گی۔"

"میرے دیکھنے سے کیا ہو گا؟"

"بھئی بیٹوں کی تصویریں دیکھتے رہنے سے بیٹا ہی ہو گا۔"

واجدہ کا منہ بن گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ کے آٹھ بیٹوں کے درمیان ایک بیٹی بھی تو ہے۔ آپ نے اس کی تصویر کیوں نہیں لگائی؟"

"بھئی بیٹی مہمان ہوتی ہے۔ شادی کے قابل ہو گی تو اپنے گھر کی ہو جائے گی۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتی ہوئی نظروں سے عبداللہ کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "آج یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ آپ عورت کے مزاج کو نہیں سمجھتے اور نہ ہی انسانی معاشرے میں اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ یعنی ماں باپ کے گھر میں وہ مہمان ہے۔ دوسرے گھر چلی جاتی ہے۔ اور جب ماں باپ کے گھر سے آپ کے ہاں آئے تو اس کی کیا قدر ہوتی ہے۔ میں بھی کسی کی بیٹی ہوں۔ جب میری بڑی باجی بیاہ کر رخصت ہوئیں تو میرے ماں باپ کے گھر میں باجی کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں یہاں بیاہ کر آئی ہوں تو میری باجی کے ہاں میری بہت سی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کیا بیٹیوں کی تصویریں نہیں رکھی جاتیں۔"

"تم فضول بحث کیوں کرتی ہو؟"

"بحث کا آغاز آپ نے کیا ہے۔ آپ عورت کو ضدی بناتے ہیں۔ آپ کی حرکتیں مجبور کرتی ہیں کہ عورت ضد میں آکر آپ کے خلاف سوچے اور وہ کرے جو آپ نہیں چاہتے اور جو آپ چاہتے ہیں وہ نہ کرے۔"

ماسٹر عبداللہ نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم وہی کرو گی جو میں چاہتا

ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں کہتی ہوں۔ یہ تصویریں یہاں سے لے جائیے۔ ورنہ یہاں میرا دم گھٹنے لگے گا۔ مجھے نہیں چاہئیں بیٹے۔ کیا اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم دونوں بیٹے کی صرف تمنا کر سکتے ہیں لیکن قدرت کو جو منظور ہو گا وہی سامنے آئے گا۔"

ماسٹر عبداللہ نے اچانک ہی اس کی گردن کے پیچھے ہاتھ لے جا کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ پھر ایک جھٹکا دے کر بولا۔ "میں بیٹا چاہتا ہوں۔ صرف بیٹا ہو گا۔"

واجدہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ عبداللہ نے ایک جھٹکا دے کر اسے پلنگ پر دھکیل دیا۔ وہ اوندھے منہ جا کر گری۔ پھر ایک دم سے غرا کر کھڑی ہو گئی۔ "تم نے آج مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ کیا سمجھ کر ہاتھ اٹھایا ہے۔ کیا میں کوئی گری پڑی عورت ہوں۔ کیا میرے باپ نے مجھے پیدا نہیں کیا۔ تم مجھے سمجھتے کیا ہو۔ میں تمہاری جھوٹی انا کو خاک میں ملا دوں گی۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔ ورنہ میں تمہارا چہرہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔"

وہ دانت پیستے ہوئے، گہری گہری سانس لیتے ہوئے اسے گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر تنتناتی ہوئی کمرے سے باہر گئی۔ عبداللہ نے اونہہ کہہ کر اسے نظرانداز کر دیا۔ باتھ روم میں جانے سے پہلے الماری کھول کر اپنا لباس نکالنے لگا۔ جب لباس نکال کر دروازے پر آیا تو اسے واجدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ ہیلو ہیلو کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "ہیلو بھائی جان! میں واجدہ بول رہی ہوں۔ آپ ابھی' اسی وقت' اسی لمحہ یہاں چلے آئیں۔ اس عبداللہ کے بچے نے آج مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نہیں آئیں گے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

عبداللہ نے بیڈ روم کے دروازے سے چیخ کر کہا۔ "تمہارا بہنوئی آکر میرا کیا بگاڑ لے گا۔ اگر کوئی ہمارے ازدواجی معاملات میں مداخلت کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ پھر وہاں سے آیا تو لباس بدل کر ناشتہ نہیں کیا۔ نیچے اتر کر دفتر میں چلا گیا۔ اس کے پانچ منٹ کے بعد ہی سرفراز علی کی گاڑی نظر آئی۔ وہ اور اس کی بیگم گاڑی سے باہر آئے۔ بیگم نے دور سے ہی آفس میں بیٹھے ہوئے ماسٹر

عبداللہ کو غصے سے دیکھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی فلیٹ میں چلی گئی۔ سرفراز علی نے دفتر میں آکر کہا۔ "عبداللہ ذرا اوپر چلو' تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"گھر کی باتیں گھر میں ہوتی ہیں اور یہ دفتر کا وقت ہے۔ میں ڈیڑھ بجے کے لنچ کے لیے اوپر جاتا ہوں۔ اس وقت گھریلو باتیں کر سکتا ہوں۔"

"میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ چند منٹ کے لیے چلو' پھر آجانا۔"

"میں نے کہانا' میں آپ کا یا کسی کا نہیں صرف وقت کا پابند ہوں۔"

"کیا ضد اور ہٹ دھرمی سے رشتے قائم رہتے ہیں؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ کی سالی ماں بننے والی ہے۔ اس وقت تک رشتہ ضرور قائم رہے گا۔ اس کے بعد آپ چاہیں تو توڑ سکتے ہیں ورنہ میں تو رشتہ نباہ رہا ہوں۔"

سرفراز علی نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر دفتر سے نکل کر وہ بھی اوپر چلا گیا۔

عبداللہ کا خیال تھا کہ واجدہ کی بہن اور بہنوئی لنچ تک وہاں ضرور رکیں گے اور اس کا انتظار کرتے رہیں گے لیکن آدھ گھنٹے بعد ہی میاں بیوی باہر آگئے اور کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ عبداللہ کو بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نے فلیٹ میں آکر پوچھا۔ "کیا ہوا' تمہارے تیس مار خاں بہنوئی آئے تھے۔ کیا بگاڑ لیا میرا۔"

"کچھ نہیں۔ وہ مجھے سمجھا کر گئے ہیں کہ شوہر سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔"

"بہت خوب' یعنی تمہارے بہنوئی میری توقع سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئے۔"

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں عورت ہوں۔ نادان ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اس نے واجدہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں تم میری شریکِ حیات ہو۔ تمہاری غلطیوں کو معاف کرنا میرا فرض ہے۔ بولو' کیا پروگرام ہے۔ کہیں گھومنے چلو گی۔ باہر چل کر کچھ کھاؤ گی' میرا خیال ہے صبح سے تم نے کچھ کھایا نہیں ہے۔"

"میں کچھ نہ کچھ کھا ہی لوں گی۔ شام کو ہم گھومنے چلیں گے۔"

پروگرام کے مطابق وہ شام کو اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر نکلی۔ اس نے کہا۔ "چلئے' باجی کے ہاں چلتے ہیں۔ وہیں رات کا کھانا کھائیں گے۔ پھر اطمینان سے واپس آئیں گے۔"

☆========☆========☆

وہ سرفراز علی کے ہاں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے رات کا کھانا کھایا۔ دو تین گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد وہ لوگ واپس آگئے۔ دوسری صبح وہ لباس بدلنے کے بعد اپنا بریف کیس اٹھا کر نیچے آیا تاکہ گیراج اور اپنے دفتر کو کھول سکے لیکن وہاں پولیس کی ایک بھاری جماعت دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ایک پولیس انسپکٹر سیڑھیوں کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر! واپس فلیٹ میں نہ جانا۔ سیدھے یہاں چلے آؤ اور بریف کیس میرے حوالے کر دو۔"

"کیا بات ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے؟"

اس وقت وہاں آس پاس کے دکان داروں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ پولیس کے آدمی لوگوں کو دور بھگا رہے تھے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "پہلے اپنا دفتر کھولو' وہیں باتیں ہوں گی۔"

اس نے ماسٹر عبداللہ سے بریف کیس لے لیا تھا۔ عبداللہ نے اپنے دفتر کا شٹر کھولا۔ پھر وہ اندر آئے۔ انسپکٹر نے کہا۔

"تمہارے آس پاس کے جو معزز دکان دار ہیں اور جو تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہیں بلالو۔"

ماسٹر عبداللہ نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ پھر چند معزز دکان داروں کو بلا لیا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "دیکھیے' میں آپ کے سامنے ان کا بریف کیس کھول رہا ہوں۔ آپ لوگوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ بریف کیس لے کر ابھی اپنے گھر سے آرہے ہیں۔"

سب نے انسپکٹر کی تائید کی۔ بریف کیس کو کھولا گیا اوپر کچھ اہم کاروباری کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے ان کاغذات کو ہٹایا تو نیچے سے پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی سی تھیلیوں میں کوئی چیز نظر آئی۔ انسپکٹر نے ایک تھیلی کو اٹھا کر ناک کے قریب لانے کے بعد سونگھا۔ "دیکھیے صاحبان! یہ چرس ہے۔"

سب حیرانی سے بریف کیس کو دیکھنے لگے۔ ماسٹر عبداللہ نے تلملا کر کہا۔ "یہ میرے خلاف سازش ہے۔ میں نہیں جانتا' یہ چرس میرے بریف کیس میں کیسے آگئی۔"

انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جادو سے آگئی۔ تمہارے خلاف سازش کرنے والے جادو جانتے ہوں گے لیکن ہم بھی بہت دور تک جانتے ہیں۔ ہماری خفیہ پولیس کے آدمی اتنی گہری خبر رکھتے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ "جاؤ' قریب میں کوئی فوٹوگرافر ہو گا تو اسے لے آؤ۔"

فلیش گن کے ساتھ لانا تاکہ تصویریں صاف اتر سکیں۔"

ماسٹر عبداللہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ انسپکٹر نے کہا۔

"آپ تمام لوگ یہاں کے معزز دکان دار ہیں اور یہاں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے چرس پکڑی ہے' اور ابھی ایک جگہ سے اور چرس برآمد ہو گی۔ ہماری خفیہ پولیس والے جو اطلاعات ہمیں پہنچاتے ہیں وہ غلط نہیں ہوتیں۔ آپ سب کو یہاں تحریری بیان دینا ہو گا کہ آپ سب کے سامنے یہ چیزیں برآمد کی گئی ہیں۔"

ایک بوڑھے دکان دار نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! یہ تو درست ہے کہ ہمارے سامنے یہ چیزیں برآمد ہوئی ہیں لیکن ہم ماسٹر عبداللہ کو ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ آج تک ہم نے ان کے اندر کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ ان کا کاروبار نہایت صاف ستھرا ہے۔ کاروں کی خریدوفروخت کرنے والے اور مرمت کرانے والے اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ ایمان داری سے کام کرتے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "بھائی جان! میں ایسے بے شمار شریف انسانوں کو پیش کر سکتا ہوں جو اوپر سے بگلا بھگت ہوتے ہیں اور اندر ہی اندر اپنے سیاہ کارناموں کو چھپائے رکھتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ماسٹر عبداللہ کے گھر میں آج کون سا سالن پک رہا ہے؟"

دو چار آدمیوں نے کہا۔ "جناب! ہم گھر کی بات کیا جانیں۔"

"اسی طرح آپ کسی کے دل کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ آج سے تقریباً بارہ یا تیرہ برس پہلے یہ ماسٹر عبداللہ نہایت ہی غریب آدمی تھا۔ ایک گیراج میں مکینک کا کام کرتا تھا۔ پھر جب گیراج کے مالک حاجی صاحب نے وفات پائی' اس کے ایک ہفتے بعد ہی یہ اچانک مال دار ہو گیا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ اتنی ساری دولت اس کے پاس کہاں سے آئی ہو گی؟"

وہ سب انکار میں سر ہلانے لگے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "میں بھی نہیں جانتا کہ یہ اچانک دولت مند کیسے بن گئے لیکن یہ چرس بتا رہی ہے کہ یہ حضرت منشیات کے پرانے کاروباری ہیں۔ آج سے بارہ تیرہ برس پہلے بھی یہی کرتے آئے تھے اور اسی سے دولت کمائی ہے۔"

اتنے وہ سپاہی ایک فوٹو گرافر لے آیا۔ تصویریں مختلف زاویوں سے اترنے لگیں۔ بریف کیس کے ساتھ ماسٹر عبداللہ اور انسپکٹر اور چند سپاہیوں کی تصویریں بھی اتاری جا

رہی تھیں تاکہ پولیس کا کارنامہ اخبارات میں شائع ہو سکے۔ ماسٹر عبداللہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ انسپکٹر سے بار بار کہہ رہا تھا۔ "میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "ہاں' ایسے وقت میں سبھی مجرم تنہائی میں مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ ضرور تمہیں بھی موقع دوں گا۔ پہلے اپنی کار کی چابی نکالو اور گاڑی کا دروازہ کھولو۔"

"جناب! کار میں تو کچھ نہیں ہے۔"

"اگر کچھ نہیں ہے۔ تو گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے اور ہم اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں۔ چلئے صاحبان! آپ لوگ بھی دیکھ لیں۔"

وہ سب لوگ گیراج کے سامنے کھڑی ہوئی اس کار کے پاس آئے جس میں پچھلی شام عبداللہ' واجدہ کے ساتھ اس کے میکے گیا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ انسپکٹر نے دو سپاہیوں سے کہا۔ "یہ اسٹیئرنگ سیٹ والی گدی کو اٹھاؤ۔"

اس گدی کو ہٹایا گیا۔ اس کے نیچے سے پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں چرس نظر آ رہی تھی اور وہ تھیلیاں بڑی ترتیب سے اس سیٹ کے نیچے رکھی گئی تھیں۔ انسپکٹر کے حکم سے فوٹو گرافر اس جگہ کی تصویریں بھی مختلف زاویوں سے لینے لگا۔ ہر تصویر میں ماسٹر عبداللہ کو شامل کیا گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اتنی بڑی سازش کون کر سکتا ہے۔ اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ رہ رہ کر صرف واجدہ کی طرف دھیان جاتا تھا لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ وہ اس کے خلاف اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے اور کیسے اٹھائے گی۔ بھلا ایک عورت کے پاس اتنی ڈھیر ساری چرس کہاں سے آ جائے گی اور وہ بریف کیس کے اندر یا کار کی سیٹ کے نیچے کیسے رکھ سکے گی۔

اب وہ لوگ پھر دفتر میں آ گئے تھے۔ انسپکٹر وہاں کے دکان داروں سے تحریری بیان پر دستخط لے رہا تھا اور عبداللہ سوچتا جا رہا تھا۔ پھر اس کے دماغ میں بات آئی۔ بریف کیس نمبروں کے ذریعے لاک ہوتا ہے اور وہ جن نمبروں کے ذریعے بریف کیس کو لاک کرتا ہے۔ وہ نمبر واجدہ کو معلوم ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کل شام کو اس نے تین گھنٹے واجدہ کے میکے میں گزارے تھے۔ کھانے پینے میں مصروف رہا تھا۔ اس دوران کار ان کی کوٹھی کے احاطے میں کھڑی تھی۔ اسی وقت شاید چرس کے پیکٹ سیٹ کے نیچے رکھ دیئے گئے تھے۔ ماسٹر عبداللہ کا شبہ یقین میں بدلتا جا رہا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت

نہیں تھا۔ اگر وہ چیخ چیخ کر کہتا کہ اس کی بیوی اور اس کی بیوی کے بہنوئی نے مل کر اس کے خلاف سازش کی ہے تو کوئی یقین نہ کرتا۔

جن معزز دکان داروں پر ماسٹر عبداللہ کو بھروسا تھا' وہی اس کے خلاف تحریری بیان دے چکے تھے۔ انسپکٹر نے تمام کاغذوں کو سمیٹ کر اپنی تحویل میں لیتے ہوئے کہا۔ "اب ماسٹر عبداللہ کا بیان تھانے میں لیا جائے گا۔ انہیں ہتھکڑی لگا دو۔"

وہ گڑگڑا کر بولا۔ "نہیں نہیں انسپکٹر صاحب! میں عزت دار آدمی ہوں۔ یہاں سے ہتھکڑی پہن کر جاؤں گا تو پھر کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔"

انسپکٹر نے دکانداروں سے کہا۔ "اچھا اب آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ میں ان سے کچھ باتیں کرلوں۔"

وہ سب چلے گئے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "جانتے ہو بغیر ہتھکڑی کے جانے والے شریف مجرم ہماری جیب کس حد تک گرم کرتے ہیں۔"

"آپ جو کہیں گے میں وہ پیش کردوں گا مگر مجھے ہتھکڑی نہ لگایئے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تھانے میں چل کر معاملات طے کریں گے۔ چلئے۔"

وہ اسے ہتھکڑی لگائے بغیر تھانے لے آئے۔ وہاں انسپکٹر نے اس کے سامنے سفید کاغذ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تفصیل سے بیان لکھو۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "جناب! میں کیا لکھوں۔"

"میں بول رہا ہوں۔ تم لکھتے جاؤ۔"

"کیوں نہ ہم معاملات طے کرلیں۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے کارروائی پوری ہونی چاہیے۔"

وہ قلم اٹھا کر کاغذ پر جھک گیا۔ انسپکٹر بولنے لگا اور وہ لکھنے لگا۔ "لکھو' میں مسمی ماسٹر عبداللہ ولد جو تمہارے.......... والد کا نام ہے وہ ولدیت لکھو۔ پھر لکھو کہ حاجی کریم بخش کے گیراج سے کام چھوڑنے کے بعد تم نے منشیات کا دھندا شروع کیا تھا۔"

وہ گڑگڑا کر بولا۔ "جناب! میں نے یہ دھندا کبھی نہیں کیا۔"

انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "جو کہتا ہوں وہ لکھو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے خلاف ایف آئی آر نہ کاٹی جائے۔ کوئی رپورٹ درج نہ کی جائے تو پہلے یہ کارروائی پوری کرو۔ اس کے بعد ہمارے درمیان سمجھوتہ ہو گا۔"

وہ مجبور ہو کر پھر لکھنے لگا۔ اس سے ایسی باتیں لکھائی گئیں جن کے ذریعے وہ عادی مجرم اور منشیات فروش ثابت ہو جاتا تھا اور اس بات کا اعتراف تھا کہ اس نے ایمانداری سے نہیں بلکہ بے ایمانی سے اتنی دولت حاصل کی ہے۔

انسپکٹر کے حکم کے مطابق وہ تحریری بیان مکمل کرنے کے بعد بولا۔ "جناب' اب تو سمجھوتے کی بات کیجئے اور اس کارروائی کو ختم کر دیجئے۔ ان کاغذوں کو پھاڑ دیجئے۔"

"سمجھوتہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ ہماری خفیہ پولیس کے جو آفیسر ہیں۔ وہی اس کا فیصلہ کرسکتے ہیں اور وہ دیکھو' وہ آرہے ہیں۔"

اس نے کرسی پر سے گھوم کر دیکھا۔ تھانے کے دروازے سے سرفراز علی داخل ہو رہا تھا اور تمام پولیس والے اسے اٹینشن ہو کر سیلوٹ کر رہے تھے۔ ماسٹر عبداللہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ سرفراز علی نے قریب آکر اس کاغذ کو اٹھایا جس پر اس نے تحریری بیان دیا تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد عبداللہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے دوست اور رشتے دار سب یہی جانتے ہیں کہ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا ہوں۔ خفیہ پولیس والے اپنے خاص رشتے داروں سے بھی اپنی اصلیت چھپاتے ہیں۔ ویسے میری بیوی اور میری سالی جانتی ہیں کہ میں کیا ہوں۔ تم سے یہ بات چھپائی گئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہ وقت آئے گا۔ جو حرکتیں تم نے اپنی پہلی اور دوسری بیویوں کے ساتھ کی ہیں' ہم اس کے لیے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے' اب تمہیں ہوش آگیا ہو گا۔"

وہ اپنی کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اگر میں فوری طور پر کسی وکیل کی خدمات حاصل کرلیتا تو بہتر ہوتا۔"

سرفراز علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم کہو ہم تمہارے کسی پسند کے وکیل سے رابطہ قائم کرکے اسے یہاں بلا لیتے ہیں۔"

"اب کیا ہو گا۔ میں نے اپنا تحریری بیان دے دیا ہے۔"

اس نے تحریری بیان کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "سمجھ لو کہ تم نے بیان نہیں دیا ہے۔ اپنے وکیل کو بلاؤ اور وہ جو مشورہ دیتا ہے' اس کے مطابق بیان دو۔ کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کرے گا کہ تمہیں مال کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے اور اس کی تصویریں موجود ہیں۔ پھر تمہارے آس پاس کے شناسا دکان داروں نے تمہارے خلاف تحریری بیان دیا ہے۔ تمہارے ایک بیان سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ وہ ہمارے

حق میں ہو یا نہ ہو۔ اس نے جیب سے تہہ کیے ہوئے کاغذ کو نکال کر کہا۔ یہی ہے نا تمہارا بیان۔ کہو تو ابھی میں تمہارے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوں لیکن جب میں اس کو پھاڑ کر پھینک دوں گا تو تمہیں حوالات اور جیل جانے سے نہیں روکوں گا۔ تمہاری ضمانت نہیں دوں گا اور تم ...."

وہ بات ختم ہونے سے پہلے ہی بولا۔ "نہیں‘ آپ واجدہ کے بھائی جان ہیں تو میرے بھی بھائی جان ہیں۔ میں اب کوئی کشیدگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جیسا کہیں گے‘ ویسا ہی کروں گا لیکن مجھے یہاں سے لے چلیں۔"

سرفراز علی نے اپنی دوسری جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ انسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میری طرف سے ماسٹر عبداللہ کے لیے ضمانت نامہ ہے۔ اسے پڑھ لیں اور ماسٹر عبداللہ سے ایک اور معافی نامہ لکھوائیں۔ چلو‘ میں ہی لکھواتا ہوں۔ بیٹھو اور لکھو۔"

ماسٹر عبداللہ دوسرے کاغذ پر لکھنے لگا۔ "میں مسمی ماسٹر عبداللہ ولد فلاں جناب سرفراز علی کی ضمانت پر چند شرائط کی بنیاد پر رہا کیا جا رہا ہوں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ میں آئندہ ایسا غیر قانونی کاروبار کبھی نہیں کروں گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مجھے اس شہر میں منشیات فروشوں کے جتنے اڈوں کا پتا معلوم ہے‘ ان کی نشاندہی کروں گا۔"

وہ لکھتے لکھتے رک گیا۔ اس نے سرفراز علی کو دیکھ کر کہا۔ "لیکن بھائی جان میں تو کسی بھی منشیات فروش کو نہیں جانتا ہوں۔"

"جو بول رہا ہوں وہ لکھتے جاؤ‘ اور ان کے نام پتے بھی لکھتے جاؤ۔"

وہ اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ جیسا لکھایا جا رہا تھا ویسا ہی لکھتا چلا گیا۔ جب وہ تحریر مکمل ہو گئی تو سرفراز علی نے اس کاغذ کو انسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو‘ اس میں ان مجرموں کے نام اور پتے ہیں۔ تم باری باری ان اڈوں پر چھاپے مارتے جاؤ گے اور انہیں مال کے ساتھ گرفتار کرتے رہو گے تو تمہاری ترقی ہو جائے گی۔ میں نے وعدہ کیا تھا۔ اب پورا کر رہا ہوں۔"

انسپکٹر نے خوش ہو کر کہا۔ "جناب! آپ واقعی بہت گریٹ ہیں۔ یقیناً میں نے اگر ان اڈوں پر کامیاب چھاپے مارے تو میری ترقی ہو جائے گی۔"

سرفراز علی نے کہا۔ "جو میرے کام آتا ہے میں اس کے کام آتا ہوں۔ بہرحال یہ

جتنی تصویریں ہیں‘ دکان داروں کے تحریری بیان ہیں اور ماسٹر عبداللہ کا بھی تحریری بیان ہے۔ یہ سب میرے دفتر پہنچا دینا۔ میں ان سب کو اپنی ذاتی فائل میں رکھوں گا۔"

پھر وہ ماسٹر عبداللہ کے ساتھ باہر آیا۔ اس کی کار میں بیٹھ کر بولا۔ "پہلے میرے گھر چلو۔ واجدہ وہیں ہے۔ اسے لے کر گھر چلے جانا۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے اسی طرف جانے لگا۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر سرفراز علی نے کہا۔

"تم جانتے ہو‘ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہے۔ میں اور میری بیگم واجدہ کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔ اس کا کوئی دکھ نہیں دیکھ سکتے۔ اس بات کا اچھی طرح خیال رکھنا تاکہ آئندہ مجھے تمہارے خلاف کوئی قدم نہ اٹھانا پڑے۔"

وہ خاموش رہا۔ سرفراز علی نے کہا۔ "مجھے خاموشی نہیں جواب چاہیے۔"

"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں‘ میں اسے مان رہا ہوں۔ زبان اس لیے نہیں کھولنا چاہتا کہ جو میں نے کیا‘ اس پر شرمندہ ہوں۔"

"اگر شرمندگی اور پچھتاوا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ میں چونکہ شاطر مجرموں سے دوچار رہتا ہوں۔ اس لیے ان کی ظاہری معصومیت سے دھوکا نہیں کھاتا۔ پتا نہیں تم اوپر سے ہی معصوم بن گئے ہو یا معصومیت اب تمہارے اندر بھی ہے۔ بہرحال اتنا یاد رکھنا‘ اگر تم یہ سوچو گے کہ واجدہ کو کوئی تکلیف پہنچاؤ یا ایسی کوئی انتقامی کارروائی کرو جس سے واجدہ کو جسمانی یا ذہنی تکلیف پہنچے یا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تو یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ تمہاری.........."

وہ چپ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد بولا۔ "میں آگے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ جب وقت آئے گا تو تم دیکھ لو گے۔ میں آج اس اعتماد سے واجدہ کو تمہارے ساتھ رخصت کروں گا کہ تمہاری دکھتی رگ میرے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔"

وہ گھر پہنچ گئے۔ واجدہ اور اس کی باجی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے لیے دوپہر کا کھانا لگایا۔ پھر کھانے کے دوران واجدہ کی باجی نے کہا۔ "عبداللہ تم نے دیکھا کہ ہم نے واجدہ کی شادی کرنے کے لیے تم سے کوئی بہت بڑا مطالبہ نہیں کیا۔ چونکہ تمہاری ایک بیوی پہلے سے ہے اور اس کی کئی اولادیں بھی ہیں۔ اس لیے ہم نے واجدہ کے مستقبل کی ضمانت طلب کی۔ تم نے کہا‘ تمہاری آخری سانس تک یہ شریکِ حیات رہے گی تو تمہاری

دولت اور جائیداد سے اسے معقول اور قانونی حق ملے گا۔ اسے ہم نے تسلیم کر لیا۔ مہر کی رقم بھی زیادہ نہیں رکھی۔ تم پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا۔ صرف اس لیے کہ ہم محبت چاہتے ہیں۔ محبت سے ایک دوسرے کا گھر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اگر پولیس ملازمت کے متعلق تمہیں نہیں بتایا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم کوئی بات سسپنس میں رکھنا چاہتے تھے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ان کی ملازمت ایسی ہے کہ اسے راز میں رکھا جاتا ہے لیکن تم نے جو حرکت کی اس کے پیشِ نظر انہیں تمہارے سامنے کھل کر آنا پڑا۔ دیکھو، ہم شریف انسان ہیں۔ جب ہم عورت کی عزت ماں کے روپ میں، بیٹی کے روپ میں اور بہن کے روپ میں کرتے ہیں تو بیوی کے روپ میں بھی کرنا چاہیے۔"

اسے اچھی طرح نصیحت کرنے کے بعد واجدہ کو اس کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے پھر کبھی حاکمانہ انداز میں یا عاجزانہ انداز میں یہ نہیں کہا کہ بیٹا چاہیے۔ جب تک آدمی اپنی طاقت کے زعم میں رہتا ہے، فرعون بنا رہتا ہے۔ اس وقت تک کوئی نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی۔ جہاں کہیں اس کی رگ دبتی ہے۔ وہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ تو نصیحتیں سمجھ میں آتی ہیں اور اثر بھی کرتی ہیں۔ اب یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ جب اللہ کی دین سے انکار نہیں کیا جاتا ہے تو پھر بیٹا یا بیٹی بھی اللہ کی دین ہے جو مل جائے اس کے لیے اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

☆=========☆=========☆

شادی کے دس ماہ بعد واجدہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ ماسٹر عبداللہ نے اپنے رب کا شکر دل ہی دل میں ادا کیا یا نہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا لیکن اوپر سے وہ خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ سرفراز علی نے بہت پہلے ہی وارننگ دے رکھی تھی کہ واجدہ کو کوئی ذہنی تکلیف بھی نہ پہنچائی جائے۔ لہٰذا اسے خوش رکھنے کے لیے اسے بھی خوشی کا اظہار کرنا ہی پڑا۔

عام مشرقی رواج کے مطابق عورت کی پہلی زچگی میکے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا واجدہ بھی زچگی سے پہلے میکے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد بھی دو ماہ تک وہاں رہی۔ ماسٹر عبداللہ روز اس سے ملنے جاتا تھا اور بچی کو کبھی کبھی گود میں لیتا تھا۔ دو ماہ بعد واجدہ اچھی طرح صحت مند ہو کر اپنے شوہر کے فلیٹ میں آگئی۔ عبداللہ اس روز بہت خوش تھا۔ وہ شام کو اسے اپنی کار میں بٹھا کر سیر کراتا رہا۔ بچی بھی ان کے پاس رہی۔ پھر وہ شام کو اسے فلیٹ پر چھوڑ کر ایک ضروری کام کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے جلد ہی واپس آگیا۔ رات کے آٹھ بجے

جب وہ فلیٹ میں داخل ہوا تو واجدہ اس کی طرف پشت کیے فون پر کسی سے گفتگو کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ دیکھو بہن کسی نہ کسی طرح اپنے مرد کو سمجھانا پڑتا ہے۔ اگر تم زبان سے نہیں سمجھا سکتی ہو تو زچہ اور بچہ کے متعلق بہت سی کتابیں بازار سے عام ملتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو پڑھنے کے لیے دو۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ اور ہر شوہر کو تسلیم کرنا چاہیے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ کبھی ایک سال تک، کبھی دو ڈھائی برس تک اور زیادہ سے زیادہ تین برس تک دودھ پیتا ہے۔ اس حساب سے کم سے کم تین برس اور زیادہ سے زیادہ پانچ برس تک کوئی دوسری اولاد نہیں ہونی چاہیے۔ یہ عورت کی صحت کے لیے، بچے کی پرورش کے لیے اور ایک خوش حال گھرانے کے لیے نہایت لازمی ہے۔

ماسٹر عبداللہ مستی میں چُور، مسرتوں سے بھرپور آیا تھا۔ دروازے پر ہی واجدہ کی باتیں سن کر ایک دم سے سرد پڑ گیا۔ واجدہ اس وقت ریسیور کان سے لگائے دوسری طرف کی باتیں سن رہی تھی اور جواب میں ہوں، ہاں کرتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے جواباً کہا۔

"بے شک اولاد اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن میں ایسی مثالیں پیش کر سکتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی دین ضرورت سے زیادہ ہو تو وہ زحمت بن جاتی ہے۔ مثلاً ہماری فصل کے لیے بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ بارش ہو تو ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ بارش ضرورت سے زیادہ ہو تو ہم اذانیں دیتے ہیں۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں کہ بس اللہ کی دین محدود ہو جائے اور بارش نہ ہو۔ اسی طرح ہمیں دنیا بھر کی نعمتیں کھانے کے لیے ملتی ہیں۔ دسترخوان پر اللہ تعالیٰ کی دین ہمارے سامنے ہماری ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ہم اتنا ہی کھاتے ہیں جتنا ہم ہضم کر سکیں۔ جب ہم ہاضمے اور اپنے جسمانی نظام کا اتنا خیال رکھتے ہیں، تو ملکی نظام کا خیال کیوں نہیں رکھ سکتے۔ ہماری حُب الوطنی کا تقاضا ہے کہ ہم بچے کم اور خوش حال گھرانہ کے اصول پر عمل کریں۔

ماسٹر عبداللہ نے سوچا، کمرے میں چپ چاپ آئے اور ایک صوفے پر بیٹھ جائے۔ پھر سوچا، اس کی آہٹ سنائی دے گی تو واجدہ کی باتیں ادھوری رہ جائیں گی۔ چپ چاپ کھڑے رہنے سے اس کے خیالات کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ واجدہ خود کیا چاہتی ہے اور جو چاہتی ہے وہی ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے دوسری خواتین کو مشورہ دیتی رہتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، بہن دراصل میاں اور بیوی دونوں کو تعاون کرنا چاہیے

لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یا تو عورت بالکل ہی مرد کے دباؤ میں رہتی ہے یا پھر مرد سیر ہو تو آپ سوا سیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جو عورتیں خودمختار ہوتی ہیں یا صاحبِ جائیداد ہوتی ہیں یا کہیں ملازمت کے ذریعے اچھی خاصی ماہانہ آمدنی گھر میں لاتی ہیں تو وہ شوہروں کے دباؤ میں رہنے کے باوجود ان کی ناجائز باتیں تسلیم نہیں کرتیں اور ایک خوش حال گھرانے کے لیے جو ضروری ہوتا ہے وہ باتیں اپنے شوہر سے منوا لیتی ہیں لیکن جو عورتیں ان پڑھ ہوتی ہیں یا اپنی غربت کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے شوہر کے دباؤ میں رہتی ہیں' وہ اپنے میاں کی ہر جائز اور ناجائز باتوں کو تسلیم کرتی چلی جاتی ہیں۔

وہ چپ ہوئی۔ دوسری طرف کی باتیں سننے لگی۔ پھر اس نے جواباً کہا۔ "بہن! میری بات تو نہ پوچھو۔ میرے میاں اتنے اچھے ہیں کہ ان کا جواب ہی نہیں ہے۔ ہم دونوں تعلیم یافتہ ہیں اور ہم اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی' کم سے کم وسائل اور زیادہ سے زیادہ مسائل کو خوب سمجھتے ہیں اور جیسا کہ آپ جانتی ہیں' میرے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے۔ اب ہم پانچ چھ برس تک کسی بچے کے متعلق نہیں سوچیں گے۔"

ماسٹر عبداللہ وہاں سے پلٹ گیا۔ دبے قدموں چلتا ہوا زینے کی ریلنگ کے پاس آیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن وہ آندھیاں اب ایک آدمی کو مردوں جیسا غصہ نہیں دلا سکتی تھیں۔ اب اسے رفتہ رفتہ تعلیم یافتہ مردوں کی طرح سوچنا' سمجھنا اور مثبت انداز میں فیصلے کرنے کا سلیقہ آتا جا رہا تھا۔ وہ زینے کے ایک پائیدان پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ اندر سے اب واجدہ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے پاس آیا تو ڈرائنگ روم خالی تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ روم میں آیا۔ واجدہ وہاں موجود تھی۔ بچی پالنے میں سو رہی تھی۔ واجدہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا آج کھانا نہیں کھلاؤ گی۔"

"ضرور کھلاؤں گی لیکن پہلے ہم......... باتیں کریں گے اور ایک دوسرے کو اپنے اعتماد میں لیں گے۔ پھر اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔ رات تو ہماری ہے۔"

وہ خوش ہو گیا۔ آئینے کے سامنے آ کر اس نے اپنی انگلیوں سے بالوں کو درست کیا۔ سنگھار میز پر سے واجدہ کا پسندیدہ پرفیوم اٹھا کر اپنے لباس پر ذرا سا اسپرے کیا۔ پھر پلٹ کر

اس کے پاس آتے ہوئے بولا۔ "تم واقعی تعلیم یافتہ اور ذہین بیوی ہو۔ تم نے میری سوچ بدل دی۔"

واجدہ نے اپنے قریب رکھے ہوئے ایک تکیے کو اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "بچی نے مجھے مہلت نہیں دی مجھے فرصت نہیں ملی۔ آپ ذرا اس پر غلاف چڑھا دیں۔"

ماسٹر عبداللہ کی انا کو ذرا ٹھیس پہنچی۔ یوں لگا جیسے وہ حکم دے رہی ہے۔ اس نے شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "مجھے بغیر غلاف کے تکیہ ایسا ہی لگتا ہے جیسے تلوار نیام کے بغیر گردن کے نیچے رکھی ہو۔"

اس نے بے بسی سے گردن ہلائی۔ پھر الماری کے پاس گیا۔ اسے کھولا۔ وہاں سے ایک غلاف نکالا۔ پھر بستر کے پاس آ کر اسے چڑھانے لگا۔

یہ سچ ہے' آدمی یا تو محبت کی زبان سے زیر ہوتا ہے یا پھر وہاں دبتا ہے جہاں اس کی کوئی دکھتی رگ دبائی جاتی ہے۔

☆======☆======☆

ایک خط ایک خوشبو

لڑکیوں کو محبت اور شادی کے معاملات میں
اظہارِ رائے کی آزادی ہونی چاہیے
اور اس میں کوئی برائی نہیں ....
لیکن جہاں معاملہ ایک انار اور دو بیمار والا ہو جائے
اور دونوں بیمار سگی بہنیں ہوں‘ ایک ہی مسیحا کی مریضہ ہوں
تو فیصلہ کون کرے؟

آنسو اور قہقہے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔

پاس والے کمرے میں فرزانہ کسی سے باتیں کر رہی تھی اور بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اگر کوئی ہنسنے کی بات نہ ہوتی تو خود ہی کوئی چٹکلا چھوڑ کر ہنستی ہنساتی رہتی تھی۔

اس کی مترنم ہنسی لہراتی ہوئی فرحانہ کے کمرے میں آ رہی تھی اور اس کے آنسوؤں میں بھیگ رہی تھی۔ فرحانہ اپنے حالات سے مجبور تھی اگر کوئی رونے کی بات نہ ہوتی تو اپنے ماضی کی ایک ایک بدنصیبی کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لیتی تھی۔

دونوں بہنیں تھیں۔ ایک آنسوؤں سے گوندھی گئی تھی۔ دوسری قہقہوں کی ریشمی انگلیوں سے تراشی گئی تھی۔ ریشم کے حسن‘ اس کی نزاکت‘ اس کی ملائیت اور اس کی گلابیت کو یکجا کرنے سے فرزانہ کا سبک سراپا مکمل ہو جاتا تھا۔ بی‘ اے کی طالبہ تھی۔ گھر سے کالج اور کالج سے اپنے ماموں جان کے گھر تک اس کی دنیا محدود تھی۔ اس محدود اور مختصر سی دنیا میں اس نے مسرتوں اور قہقہوں کے بیشمار جگنو پکڑے تھے اور وقتاً فوقتاً تنہا اور بوریت کے اندھیرے میں ان جگنوؤں کو ستاروں کی طرح بکھیر دیتی تھی۔ ذہین تھی‘ سمجھدار تھی۔ ستاروں تک ہاتھ نہ پہنچے تو روتی نہیں تھی‘ جگنوؤں سے بہل جاتی تھی۔

فرحانہ اس کی بڑی بہن تھی۔ ستاروں تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ اس لئے رو رہی تھی........ پہلا ستارہ افسر تھا۔ جس کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا تھا۔ افسر اپنی ہی برادری کا ایک تعلیم یافتہ‘ خوبصورت اور سمارٹ نوجوان تھا۔ فرحانہ کو جی جان سے چاہتا تھا۔ چاہنے اور چاہے جانے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے منگیتر بھی تھے۔

پھر ایک روز افسر کے والدین شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے بات شروع ہوئی اور جہیز تک پہنچ گئی۔ وہ دروازے سے لگی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اسے یہ بات ناگوار

گزری کہ ہونے والے ساس سسر اسے بہو بنانے سے پہلے جہیز کے نام پر مول تول کر رہے ہیں۔ وہ وہاں سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

جب اس کے ساس سسر چلے گئے تو اس کی امی نے اسے بلایا اور مٹھائی کی تھال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ بیٹی۔ اسے چکھ لو۔ تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔"

مٹھائی دور ہی سے زہر لگ رہی تھی۔ وہ چکھنے کے بجائے بولی۔

"وہ جہیز میں کیا مانگ رہے تھے؟"

اس کے ابو نے حقہ کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا! کیا مانگیں گے۔ جتنا انہوں نے مانگا ہے۔ ہم اس دوگنا دے سکتے ہیں۔"

"آخر پتہ تو چلے۔" اس نے امی سے پوچھا۔

اس کی امی نے پان کی گلوری منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیس تولے سونا' صوفہ سیٹ' ٹی وی' ریڈیو گرام' ریفریجریٹران کے علاوہ افسر میاں کرشن نگر والی کوٹھی' ایک کار اور پچاس ہزار نقد مانگ رہے ہیں۔"

یہ مطالبات سن کر وہ ہکا بکا سی ماں کا منہ تکتی رہ گئی۔ اسے اپنی توہین کا احساس ہونے لگا۔ جس افسر پر وہ اتنا ناز کرتی تھی' وہ اسے اپنانے کی بجائے اس کی امارت کو اپنا رہا تھا۔ وہ طنطناتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آئی اور افسر کی دکان کا فون نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لائن فوراً ہی مل گئی۔ دوسری طرف سے بات کرنے والا افسر ہی تھا۔

"ہیلو فرحانہ۔ مبارک ہو۔ تاریخ طے ہوگئی ہے۔"

"مبارکباد تو مجھے دینا چاہئے کہ تمہارے تینوں مطالبات پورے ہو رہے ہیں۔"

"ہاں ابھی امی نے تمہارے ہاں سے فون کرکے بتایا تھا۔ تم تو جانتی ہو۔ کوٹھی' کار اور بینک بیلنس کے بغیر آدمی کی قدر نہیں ہوتی۔"

"جانتی ہوں۔" وہ تلملا کر بولی۔ "تمہیں اپنی حیثیت بنانے اور بھیک مانگنے کے لئے میرا ہی دروازہ ملا تھا۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟"

"ہوش میں ہوں اور اپنی غلطی کو سمجھ رہی ہوں کہ تم جیسے خود غرض انسان کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ تم بظاہر جتنے خوبصورت اور اسمارٹ ہو' باطن میں اتنے ہی بد

صورت اور بے ڈھنگے ہو۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے مطالبات پر۔ جاؤ کسی دوسرے دروازے پر صدا لگاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اس کی امی اور ابو دروازے پر کھڑے حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس کی امی نے غصے سے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

"اور پڑھاؤ لڑکیوں کو۔ گھر میں تو ٹائیں ٹائیں بولتی تھیں' آج سسرال والوں کو بھی بھکاری کہہ دیا۔ اری کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ ان کے مطالبات بھی پورے نہیں کر سکتے تھے۔"

وہ صوفہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"ابو نے اس لئے تعلیم دلائی ہے کہ ہمیں ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی سنبھلنے کا سلیقہ آجائے۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ انہیں مجھ سے زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ میں ایسے گھر میں نہیں جاسکتی' جہاں میری ضرورت نہ ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی اس کی امی بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن اس کے ابو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بیگم! ابھی اسے کچھ نہ کہو غلطی افسر میاں کی ہے۔ انہیں یقین ہونا چاہیے تھا کہ فرحانہ ان کے ہاں خالی ہاتھ نہیں جائے گی۔ یہ اتنی دولت اور جائیداد ہم اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جاتے؟ لیکن انہوں نے صبر سے کام نہیں لیا۔ فرحانہ بہت ہی حساس لڑکی ہے افسر میاں کے کاروباری انداز سے اسے صدمہ پہنچا ہے۔ بہر حال میں دونوں کو سمجھاؤں گا۔"

سمجھانے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک گھنٹہ بعد ہی افسر کے والدین نے فون پر انہیں کال کیا اور کہا کہ وہ ایسی لڑکی کو کبھی اپنی بہو بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ان کے بیٹے کو در در کا بھکاری کہتی ہے۔ لہٰذا آج سے ان کے تمام تعلقات ختم۔ ان سے تعلقات کیا ختم ہوئے تقریباً ساری برادری روٹھ گئی۔ برادری والوں کے تیور بدلتے دیکھ کر اس کے ابو بھی ضد میں آگئے اور کہہ دیا کہ جہنم میں جائے برادری' دولت کی مٹھاس دیکھ کر بہت سی مکھیاں آئیں گی۔

بہت سے رشتے آئے' لڑکے اچھے تھے' قبول صورت بھی اور حد درجہ خوب سیرت

بھی، محنتی بھی تھے اور خوددار بھی۔ مگر خاندانی نہیں تھے۔ یعنی سلسلہ نسب نہیں جانتے تھے کہ رضوی ہیں، جعفری ہیں، نقوی ہیں یا علوی۔ یہ جاننا نہایت ضروری تھا۔ کیونکہ تقسیم ملک کے بعد بہت سے جعلی سید پاکستان آگئے تھے اور کھوٹے کھرے کی پہچان مشکل ہوگئی تھی اور اس کے ابو برادری والوں کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے بہت ہی اونچی حیثیت کے داماد کا انتظار کر رہے تھے۔

انتظار ایک پتھر ہے جو اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ وقت ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔ وقت کے اس دریا میں فرحانہ کی عمر کا بہت سا حصہ بہہ گیا۔ اب اس کا جسم کسی صحت مند بیاہتا عورت کی طرح بھاری بھرکم ہوگیا تھا۔ حالانکہ وہ کنواری تھی، اچھوتی تھی، کوئی اس شریف زادی کی انگلی تک چھو کر نہیں گزرا تھا، مگر بعض لڑکیاں مدتوں بیٹھے بیٹھے فربہ اندام ہو جاتی ہیں۔ دور سے فرحانہ کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ بیاہتا ہے۔ صرف آنکھوں کی شرم اور حسین مکھڑے کی معصومیت بتاتی تھی کہ وہ بدنصیب کنواری ہے۔ جس کا ہاتھ ستاروں تک نہیں پہنچ رہا ہے۔

زندگی کی یکسانیت اور خواہ مخواہ کی سوچ و فکر سے بچنے کے لئے اس نے ایک اسکول میں استانی کا عہدہ سنبھال لیا اور خود کو شریر بچوں میں رہ کر بہلانے لگی۔ بہلنے کے لئے اسکول کی ہیڈ مسٹریس بھی تھیں۔ وہ بھی تیس برس کی ہوگئی تھیں اور اب تک شادی کے سپنے دیکھ رہی تھیں۔ ان سے باتیں کرکے فرحانہ کو یک گونہ تسلی ہوتی تھی کہ وہ تنہا بدنصیب نہیں ہے لیکن پچھلے دن وہ پانچویں جماعت کی ایک مسٹریس کوثر سلطانہ کی شادی میں شریک ہوئی تھی۔ تب سے دل میں پنکھے لگ گئے تھے عجیب اختلاج سا ہو رہا تھا۔ دلہن کا سرخ جوڑا دل کے لہو سے ہم رنگ ہو رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

بند کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی اور چپ چاپ آئینے سے پوچھ رہی تھی کہ وقت تو نہیں گزر گیا؟ بڑھاپا چور قدموں سے تو نہیں آرہا ہے؟

آئینہ سمجھا رہا تھا کہ ابھی دیر ہے۔ ابھی وہ سہاگن بن کر بھاگتی ہوئی عمر کو لگام دے سکتی ہے۔ دوسرے کمرے سے لہرا کر آنے والے فرزانہ کے قہقہے بھی یہی سمجھا رہے تھے کہ ہنستے رہنے سے انسان اپنی عمر سے بھی کم نظر آتا ہے۔ یہ سچ ہے منہ لٹکائے رہنے سے اچھی بھلی صورت بھی مرجھا جاتی ہے۔

وہ سوچنے لگی۔ میں ہنسی کو اپنے پاس کیسے بلاؤں؟ بلانے سے تو یہ آتی نہیں ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر بہت کوشش کرو تو ہلکی سی حزیں مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اندھی آنکھوں میں کاجل لگانے سے بینائی نہیں آجاتی۔ پھر جبراً مسکرانے سے چہرے پر شگفتگی کیسے آئے گی؟

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر آئینے کے پاس سے اٹھ گئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آگئی۔ اس کے ابو گھر میں نہیں تھے امی پڑوس کی کوٹھی میں جاکر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ فرزانہ اپنے پلنگ پر اوندھی پڑی ہوئی تھی اور فون کا ریسیور کان سے لگائے شاید اپنی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔

"دیکھو مجھ سے جھوٹ نہ کہو۔ کل میں کالج گئی تھی۔ مگر وہاں تو تمہاری پرچھائیں بھی نظر نہیں آئی۔ ہوں۔ اچھا۔ اچھا۔ اوں ہونہہ۔ یہ سبھی جھوٹ ہے۔ میں گیٹ کے پاس دس منٹ کھڑی انتظار کرتی رہی او ہو قطع کلامی نہ کرو۔ مجھے بولنے دو۔ کیا سنوں؟ تمہارے فضول سے بہانے۔ آں۔ کیا کہا۔ مس کھڑی تھیں۔ کہاں؟ کالج کے برآمدے میں؟ اچھا تو تم اس لئے چھپے ہوئے تھے۔ اسی لئے میرے سامنے نہیں آئے......"

فرزانہ کی باتیں سن کر فرحانہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی چھوٹی بہن کسی سہیلی سے باتیں کر رہی ہے۔ مگر وہاں تو اس کی گفتگو میں کوئی چھپا تھا۔ فون کے اس پار وہ کسی نادیدہ ستارے کو چھو رہی تھی۔

ہاں یہ عمر ایسی ہی ہوتی ہے۔ لڑکیاں کچھ سوچے سمجھے بغیر کسی ستارے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہیں۔ اسے چھونے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ انگارہ تھا۔

فرحانہ تشویش سے بہن کو دیکھنے لگی۔ وہ کس سے باتیں کر رہی ہے؟ کون ہے وہ اجنبی؟ کہیں وہ میری طرح کسی کو سمجھنے میں غلطی تو نہیں کر رہی ہے؟

وہ کمرے میں آگئی۔ فرزانہ اس وقت قہقہہ لگاتی ہوئی بستر پر لوٹ رہی تھی۔ اپنی باجی پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ وہ جلدی سے سنبھل کر ریسیور کے ماؤتھ پیس پر بولی۔

"شا۔ شاہینہ۔ میں پھر بات کروں گی۔ باجی آئی ہیں۔ وہ شاید فون پر کہیں باتیں کریں گی۔ خدا حافظ!"

اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

فرحانہ نے پوچھا۔ ”کون باتیں کر رہا تھا؟“

”ج۔ جی۔ وہ۔ شاہینہ تھی۔“

”میں نے تمام باتیں سن لی ہیں۔ تم سمجھ رہی تھیں کہ میں اپنے کمرے میں سو رہی ہوں۔ نہیں بے بی! کبھی دوپہر کو سونے کی عادت تھی۔ اب تو راتوں کو نیند بھی نہیں آتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں بھی بے خوابی کا روگ لگ جائے۔ تم سمجھدار ہو۔ تمہیں میرے حالات کے پیش نظر کچھ سیکھنا چاہئیے۔ اس عمر میں ہر لڑکی سطحی چمک کو دیکھتی ہے۔ انجام کار ان کی پسند کا سکہ کھوٹا نکلتا ہے۔ وہ لڑکا اتنا ہی اچھا ہے تو اس سے کہو کہ اپنے بزرگوں کو یہاں بھیجے۔ جو کام دستور کے مطابق ہوتا ہے اس میں بہتری ہوتی ہے.....“

یہ نصیحت کرکے وہ کوئی جواب سنے بغیر اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ فرزانہ چند لمحوں تک باجی کے کمرے کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سرہانے سے تکیے کو کھینچ کر اپنی گود میں رکھا۔ اس تکیے پر اپنی کہنیاں ٹیک دیں اور ہتھیلیوں کے گلدان میں پھول سے مکھڑے کو سجا کر سوچنے لگی۔

”کیا اس عمر میں ہر لڑکی غلطی کرتی ہے؟؟“

”نہیں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ سب ہی غلطی کریں۔ پھر بھی کہیں سے کوئی اچھی نصیحت ملے تو اس پر عمل ضرور کرنا چاہئیے۔ میری باجی بہت اچھی ہیں۔ مگر نصیحت کرتے وقت یہ بھول گئیں کہ دستور کے مطابق پہلے ان کا رشتہ آئے گا اور جب تک ان کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔ امی اور ابو مجھے بے بی کہتے رہیں گے۔“

بے بی کہلائے جانے پر اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ پھر اس نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے منہ کو دبا لیا تاکہ باجی یہ نہ سمجھیں کہ ان کی نصیحت کو قہقہوں میں اڑایا جارہا ہے۔

☆=====☆======☆

آیا گیٹ پر کھڑی اسکول بس کے ڈرائیور کو بتا رہی تھی کہ آج سے اسکول میں ایک نیا ماسٹر آیا ہے۔ فرحانہ اسکول کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ آیا کی بات سن کر ذرا ٹھٹک گئی۔ اسکول کے اسٹاف میں کسی نئے فرد کا اضافہ ہو تو تجسس بڑھتا ہے خصوصاً ایسے موقعہ پر جب کسی عورت کی جگہ مرد کی تقرری ہو جائے۔ فرحانہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گئی تھی۔ پھر وہ یہ سوچ کر آگے بڑھ گئی کہ ایک آیا سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں ہے۔

سامنے لان میں مسز اکرم اپنی جماعت کے بچوں کو پی ٹی کرا رہی تھیں۔ اس نے دور ہی سے فرحانہ کو دیکھ کر سلام داغ دیا۔ جب چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام کرتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ مگر آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ فرحانہ اور مسز اکرم میں کون چھوٹی ہے اور کون بڑی؟ فرحانہ کہتی تھی کہ مسز اکرم اس سے عمر میں بڑی ہیں۔ کوئی بھی سننے والا یہی کہے گا کہ شادی شدہ عورت بڑی ہوتی ہے اور کنواری ہر حال میں کم عمر سمجھی جاتی ہے۔ مسز اکرم کہتی تھی کہ سننے والے دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ مگر دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ فرحانہ عمر میں بڑی ہے۔

فرحانہ اس بات پر چڑتی تھی کہ مسز اکرم جیسی عورتیں شادی کے بعد بھی اپنی عمر کم کرتی جاتی ہیں۔ انہیں فرحانہ جیسی کنواریوں کی دل شکنی کا احساس نہیں ہوتا' اور یہ تو مسز اکرم کی عادت سی ہو گئی تھی۔ روزانہ ایک ننھی سی بچی کی طرح فرحانہ کو سلام کرتی تھی۔ وہ سلام طنز کے تیر کی طرح لگتا کہ بی بی فرحانہ تم کنواری ہو مگر مجھ سے بوڑھی ہو۔

فرحانہ نے بے دلی سے سلام کا جواب دیا تو مسز اکرم نے صبح کی تازہ خبر سنائی۔

”کوثر سلطانہ ہنی مون کے لئے مری گئی ہے۔ بھئی بڑی لکی ہے۔“

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جارہا تھا کہ فرحانہ لکی نہیں ہے۔ فرحانہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کوثر سلطانہ کی خوش نصیبی پر خوشی کا اظہار کرے یا اپنی بد نصیبی پر افسوس کرے۔ مسز اکرم نے دوسری خبر سنائی۔

”کوثر کی جگہ ایک نیا ٹیچر رکھا گیا ہے۔ اچھا ہینڈسم ہے اور کنوارہ بھی ہے۔“

آخری الفاظ بڑے رازدارانہ انداز میں خصوصاً فرحانہ کے لئے کہے گئے تھے۔ وہ اندر سے سلگ گئی۔ کنوارہ ہے تو ہوا کرے۔ یہ مسز اکرم کیا سمجھتی ہے؟ کیا میں کنواروں کی تلاش میں رہتی ہوں؟ توبہ کیسے پست خیالات ہیں اس کے نہ جانے کیسے ٹیچر بن کر یہاں آگئی ہے۔

وہ مزید کچھ سنے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ ہیڈ مسٹریس قمر النساء بیگم برآمدے سے گزر رہی تھیں۔ فرحانہ کو دیکھ کر بڑی شفقت سے مسکرائیں اور قریب آ کر بولی۔

”میں نئے ٹیچر کو چیک کرنے جارہی تھی۔ اچھا ہوا تم آگئیں ذرا آٹھویں جماعت میں چلی جاؤ۔ وہ کلاس لے رہا ہے۔ اسے چیک کرنے کے بعد مجھے رپورٹ دینا میں تم لوگوں کی پے شیٹ تیار کر رہی ہوں۔“

وہ اپنے آفس کی طرف جانے لگیں۔ فرحانہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"باجی! آپ جا کر اسے چیک کریں۔ میں پے شیٹ تیار کر لیتی ہوں۔"

قمرالنساء بیگم نے عینک کے پیچھے سے جھانک کر بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

"تم نروس کیوں ہو جاتی ہو؟"

"جی۔ میں نہیں سمجھتی۔ اس میں نروس ہونے کی کیا بات ہے۔"

"اگر کوئی بات نہیں ہے تو پھر جاؤ اور اگر یہ سوچتی ہو کہ وہ تم سے زیادہ قابل ہو گا اور تم اسے غلط ٹیچنگ پر ٹوک نہیں سکو گی تو پھر یہ احساسِ کمتری ہے۔"

"نہیں باجی۔ اے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں جاتی ہوں۔"

وہ فوراً ہی آٹھویں جماعت کی طرف پلٹ کر جانے لگی۔

ہیڈ مسٹریس اپنی دانست میں ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ نروس نہیں ہونا چاہیے۔ مگر فرحانہ کیسے سمجھاتی کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہے بلکہ مسز اکرم نے اس کے دماغ میں ایک چنگاری کو یہ کہہ کر ہوا دے دی ہے کہ وہ کنوارہ ہے۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ فرحانہ کو کسی کی ذات سے دلچسپی نہیں تھی مگر انسان کی ایک نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس سے کہے کہ فلاں پردے کی طرف نہ دیکھو تو اس کے دماغ میں کھلبلی سی ہونے لگتی ہے کہ آخر پردے کے پیچھے کیا ہے۔ وہ ضرور اسے چور نظروں سے دیکھے گا یا چور دماغ سے سوچے گا۔ بس اسی طرح فرحانہ کے دل میں ایک چور پیدا ہو گیا تھا۔

وہ آٹھویں جماعت کی کھڑکی کے پاس آ کر دیکھنے لگی۔ نیا ٹیچر بڑی ایزی انگلش میں بچوں سے سوالات کر رہا تھا اور بڑی خندہ پیشانی سے جوابات بھی بتاتا جا رہا تھا۔ بقول مسز اکرم' وہ ہینڈ سم سا تھا۔ درمیانے قد کا ایک صحت مند نوجوان جسے دیکھتے ہی فرحانہ نے بالکل غیر ارادی طور پر اس کی عمر کا حساب کیا۔ یہ محض ایک عادت سی بن گئی تھی۔ دراصل وہ دوسروں کی عمر کا حساب کر کے خود کو وقت کے ترازو پر تولتی رہتی تھی۔

وہ اچھی طرح سے حساب نہ کر سکی یا پھر وقت نہیں تھا۔ پیریڈ ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ پچھلے دروازے سے چپ چاپ کلاس میں داخل ہو گئی اور آخری بنچ پر ایک طالب علم کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اگلی دو صفوں میں لڑکیاں تھیں۔ مگر

فرحانہ وہاں تک جا کر ٹیچر کی نظروں میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بلیک بورڈ کی طرف منہ کئے ماضی بعید کا ایک جملہ انگریزی میں لکھ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"جمیلہ! تم ایک جملہ بناؤ۔"

"میں نے اسے دیکھا ہے۔ بالکل آسان ہے۔ جلدی سے کہو۔"

جمیلہ نام کی طالبہ سوچتی رہی۔ اسی وقت ٹیچر نے فرحانہ کو دیکھ لیا۔ پہلے وہ ذرا حیران ہوا۔ پھر یہ سوچ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی کہ وہ بھی کوئی ٹیچر ہے اور اسے چیک کرنے آئی ہے۔ اس نے انجان بن کر فرحانہ کو مخاطب کیا۔

"بے بی۔ تم پچھلی سیٹ پر لڑکوں کے ساتھ کیوں بیٹھی ہو۔ کیا لڑکیوں سے جھگڑا ہے؟" فرحانہ بوکھلا گئی۔ بوکھلاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ نئے ٹیچر نے اس کی عمر ایک دم سے گھٹا کر اسے بے بی بنا دیا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن فرزانہ جوان تھی مگر گھر میں آج بھی بے بی کہلاتی تھی۔ یعنی نیا ٹیچر اسے بے بی کہہ کر فرزانہ کے برابر کھڑا کر رہا تھا۔ کوئی نیا انکشاف ہو تو پہلے بوکھلاہٹ سی ہوتی ہے اور وہ انکشاف اپنی مرضی کے عین مطابق ہو تو طبیعت خوشی سے لہرا جاتی ہے۔ وہ اندر سے لہرا رہی تھی اور اوپر سے شرما گئی تھی۔

طلباء اور طالبات کے قہقہے گونج رہے تھے' وہ نئے ٹیچر کو بتا رہے تھے کہ یہ مس فرحانہ ہماری ٹیچر ہیں۔ وہ بظاہر حیرانی سے اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور قریب آ کر بولا۔

"سوری۔ میں نے آپ کو بے بی کہا ہے۔ آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سر جھکا کر بولی۔

"ناراض تو نہیں ہوں البتہ حیران ہوں کہ آپ نے مجھ جیسی بوڑھی عورت کو بچی کیسے سمجھ لیا؟"

"بوڑھی عورت؟" وہ تقریباً چیخ کر بولا۔ "یعنی کہ آپ خود کو بوڑھی کہہ رہی ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "آپ کمال کرتی ہیں۔ اگر بڑھاپا اسے کہتے ہیں تو پھر ہر لڑکی کو آپ کی طرح بوڑھی ہی رہنا چاہیے۔ یقین کیجئے اگر یہ بچے آپ کو ٹیچر نہ کہتے تو میں آپ کو ایک طالبہ ہی سمجھتا۔ بہرحال اب آپ جہاں چاہیں بیٹھ کر میرا امتحان لے سکتی ہیں۔"

وہ جھینپ کر بولی۔

"دیکھئے۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں آپ کا امتحان لینے نہیں بلکہ کچھ سیکھنے

آئی ہوں کہ آپ کس طرح تعلیم کو بچوں کے لئے دلچسپ بناتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "کچھ آپ مجھ سے سیکھئے کچھ میں آپ سے سیکھوں گا اور یہ بچے ہم دونوں سے بہت کچھ سیکھیں گے۔ ہاں تو بچو.........!"

وہ بچوں سے مخاطب ہو کر انہیں پڑھانے لگا۔ فرحانہ اس کی آواز سن رہی تھی۔ مگر اس کے خیالات کو پر لگ گئے تھے۔ وہ آٹھویں جماعت سے اڑتی ہوئی آٹھ برس کی بے بی تک پہنچی' وہاں سے اڑتی ہوئی اٹھارہ برس کی بے بی بن کر بیٹھ گئی۔ کانوں میں ایک ہی فقرہ رس گھول رہا تھا۔

"اگر یہ بچے آپ کو ٹیچر نہ کہتے تو میں آپ کو ایک طالبہ ہی سمجھتا...."

آہ! زندگی اب تک جھوٹ بولتی رہی۔ آئینہ اب تک اسے ڈراتا رہا اور جھوٹ بولتا رہا کہ وقت گزر گیا ہے۔ نہیں' سچائی ہے تو اس اجنبی کی زبان میں ہے' اس نئے ٹیچر کے آگے کوئی مصلحت نہیں تھی' کوئی لالچ نہیں تھا' وہ غیر جانبدار ہو کر اور اسے ایک طالبہ سمجھ کر ایک سچی بات کہہ گیا ہے۔

وہ زیادہ دیر تک وہاں نہ بیٹھ سکی۔ بار بار اس سچے اجنبی کی طرف نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ اسے دیکھنا کوئی جرم نہیں تھا۔ مگر دل خواہ مخواہ ایک مجرم کی طرح بدحواس ہو کر دھڑک رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر آفس میں چلی آئی۔ قمرالنساء بیگم اپنی میز کے سامنے بیٹھی پے شیٹ پر جھکی ہوئی حساب جوڑ رہی تھیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کیسا ہے؟ فرحانہ کو یوں لگا جیسے وہ اس کی پسند پوچھ رہی ہوں کہ لڑکا کیسا ہے؟ تمہارے معیار کا ہے؟ تمہاری پسند کا ہے۔ تمہارے خوابوں سے چل کر یہاں پہنچا ہے تو بتا دو۔ کیسا ہے؟ وہ ذرا جھجکتی ہوئی بولی۔

"وہ۔ بہت اچھے ہیں باجی۔ بڑی زندہ دلی سے ہنستے بولتے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔"

قمرالنساء بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری جیسی اداس رہنے والی لڑکی زندہ دلی کو سمجھتی ہے۔ میری دلی خواہش ہے فرحانہ کہ تم بھی ہنستی بولتی نظر آؤ۔ مجھے دیکھو' میری عمر تیس برس کو پہنچ رہی ہے۔ مگر میں نے شادی نہیں کی۔ جب تک بھائی کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلاؤں گی۔ سہاگ کا جوڑا نہیں پہنوں گی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میری آنکھوں میں خواب نہیں آتے؟ کوئی آئیڈیل میری سوچ کے خوبصورت فریم میں نہیں مسکراتا ہے؟ مسکراتا ہے۔ ضرور

مسکراتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے؟ ایک بہن کی شادی کر چکی ہوں۔ بھائی کی تعلیم مکمل ہونے کے لئے دو سال رہ گئے ہیں۔ بعض اوقات عورت اپنے سہاگ کا جوڑا جلا کر دوسروں کی راہیں روشن کرتی ہے اور اپنے ارمانوں کی لاش پر کھڑے ہو کر مسکراتی رہتی ہے۔ میں بھی مسکراتی ہوں۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں بھی ہمیشہ مسکراتی رہتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم بھی ہمیشہ مسکراتی رہو۔ تمہاری راہ میں زیادہ مسائل نہیں ہیں۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی ضرور ملے گا۔ لہٰذا تمہیں ہنستے مسکراتے رہنا چاہئے۔ مسکراتے رہنے سے بھاگتی ہوئی عمر کا پتہ نہیں چلتا......"

"آپ درست کہتی ہیں باجی!" وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ مجھے مسکرانا چاہئے۔"

"شاباش!" وہ مسکراتی ہوئی پے شیٹ پر جھک گئیں۔

فرحانہ کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ آ رہی تھی۔ سچ ہے کہ وقت سے پہلے کوئی چیز نہیں ملتی۔ وقت آگیا تھا اس لئے لبوں کی کلیاں مسکرا رہی تھیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔ اس وقت اس کی نظریں میز پر رکھے ہوئے کاغذات پر گئیں۔ کچھ کاغذات کے ساتھ کسی کالج کا ایک سرٹیفکیٹ نتھی کیا ہوا تھا اور اس پر کسی سید جمال عباسی کا نام لکھا ہوا تھا۔

وہ اسی نئے ٹیچر کے کاغذات ہو سکتے تھے۔ پھر بھی فرحانہ نے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سرٹیفکیٹ کس کا ہے؟"

قمرالنساء بیگم نے سر اٹھا کر ایک نظر کاغذات پر ڈالی اور جواب دیا۔

"اسی نئے ٹیچر کا ہے۔ یہ کاغذات بتاتے ہیں کہ وہ بہت ہی قابل نوجوان ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ فرحانہ نے کئی بار دل ہی دل میں اس کا نام پڑھا۔ اس نام میں ایسی جاذبیت تھی کہ ان کے حروف سے نئے ٹیچر کی شبیہہ ابھر رہی تھی اور آنکھوں میں سما رہی تھی۔ پھر اس کی نظریں سرٹیفکیٹ پر لکھی ہوئی تاریخ پیدائش پر آ کر رک گئیں اچانک ہی اس کے لبوں سے مسکراہٹ اڑ گئی۔

پھر اس کی نظریں زخمی پرندے کی طرح سرٹیفکیٹ پر پھڑپھڑاتی رہ گئیں۔

تاریخ پیدائش کے مطابق وہ سید جمال عباسی سے تین سال بڑی تھی۔ بزرگ تھی۔ بوڑھی تھی۔

پھر اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے تمام بال سفید ہو گئے ہیں۔ وہ اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہے اور اس کے پاؤں قبر کے کنارے پہنچ کر تھر تھرا رہے ہیں۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی اور سرٹیفکیٹ چھوٹ کر میز پر رہ گیا۔

وہ محض ایک تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ ایک دوشیزہ کے بڑھاپے کا تصدیق نامہ بھی تھا۔

ابھی اس نے قمرالنساء بیگم کے سامنے تسلیم کیا تھا کہ اسے مسکرانا چاہیے۔ اب وہ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچ رہی تھی کہ کس بات پر مسکرائے؟

کیا اس بات پر کہ وہ مسز اکرم سے عمر میں بڑی ہے؟ قمرالنساء بیگم کی عمر میں پہنچ رہی ہے؟ کیا اس بات پر مسکرائے کہ اس کی جوانی دبے پاؤں کس طرح گزر گئی' پتہ بھی نہ چلا۔ اس کی زندگی میں جو بھی آتا ہے اس سے کم عمر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو اس سے دو منٹ' دو ساعت یا دو سانس پہلے پیدا ہوا ہو اور جس کے سامنے وہ بچی بن جائے۔ جوان بے بی کہلائے۔ آہ کیسے نصیب لے کر آئی ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بچپن کی بعد ہوش سنبھالتے ہی بوڑھی ہو گئی تھی اور تب سے اپنوں اور غیروں کی بزرگ بنتی چلی آ رہی ہے۔

وہ اپنا سر تھامے بیٹھی رہی۔ رونے کو جی چاہتا تھا۔ مگر قمرالنساء بیگم سے مسکرانے کا وعدہ کر چکی تھی۔ اس لئے رو نہیں سکتی تھی۔ ان کے سامنے آنسو بہانے کا جواز پیش نہیں کر سکتی تھی۔

وہ وہاں سے جانے کے لئے اٹھ گئی۔ قمرالنساء بیگم نے کہا۔

"بیٹھو۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ تم کچھ کہو گی۔ مگر تم تنہا اپنا بوجھ اٹھانے کی عادی ہو گئی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے غم میں اپنے ہمدردوں کو ضرور شریک کرنا چاہیئے۔ ابھی جو زخم تمہارے سینے پر لگا ہے۔ کیا میں اس پر مرہم نہیں رکھ سکتی؟"

فرحانہ کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"مجھے۔ مجھے بھلا کون سا زخم لگے گا۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نہیں سمجھی....."

"تم سمجھ رہی ہو۔ دیکھو فرحانہ! مسز اکرم سے عمر کے معاملے میں تم سے کئی بار بحث ہو چکی ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ایک شادی شدہ عورت بھی اپنی عمر تم سے کم بتاتی ہے۔ اس سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ جمال عباسی بھی عمر میں تم سے تین سال چھوٹا ہے۔"

فرحانہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہ قمرالنساء بیگم نے اس کے خیالات کیسے پڑھ لئے۔ وہ حیرانی سے بولی۔

"آ۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

"ہاں!" وہ بولیں۔ "مجھے ایک غیر مرد سے تمہاری عمر کا موازنہ نہیں کرنا چاہیئے لیکن میں یہ جرأت کر رہی ہوں اور یہ محض اس لئے کہ جمال عباسی نے تمہیں بے بی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔"

وہ چونک کر ہیڈ مسٹریس کو دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"اس وقت میں کلاس کے باہر کھڑی ہوئی تم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جمال عباسی کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ تمہیں اپنے سے کم عمر سمجھتا ہے۔ اسے ایسا سمجھنے دو فرحانہ!"

"باجی....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔ قمرانساء بیگم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہرو۔ ابھی کوئی اعتراض پیش نہ کرو۔ پہلے میری باتوں کو غور سے سن لو۔ دیکھو' ہم عورتوں کو اسی دنیا سے کوئی ساتھی ملتا ہے۔ اسی دنیا سے اور اپنے اپنے ماحول سے کسی جیون ساتھی کے ملنے کی توقع ہو تو ہم تہذیب کے دائرے میں رہ کر اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ کر سہاگ کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ کسی کو سمجھنے اور اپنے مستقبل کے لئے سوچنے کا حق ہر عورت کو ہے۔"

"مم۔ مگر باجی....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ہچکچانے لگی۔

"تم شاید یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم عمر میں اس سے بڑی ہو؟ بوڑھی تو نہیں ہو گئی ہو؟ پھر یہ کہ جمال عباسی کی نظریں تمہیں ایک طالبہ کی طرح کم عمر سمجھتی ہیں تو پھر تم اس مسئلہ پر کیوں سوچتی ہو۔ عورت کی عمر کا فیصلہ صرف مرد کی نگاہیں کرتی ہیں اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ تم سمجھدار ہو۔ جاؤ میری باتوں پر غور کرو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

فرحانہ سر جھکا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بچوں کو پڑھانے کے لئے اپنی جماعت کی طرف جانے لگی۔

دوسرے دن جمال سے اس کا سامنا ہوا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"مس فرحانہ! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ہیڈ مسٹریس کے سامنے میری اتنی تعریفیں کیں کہ وہ مجھے مستقلاً یہاں ٹیچر رکھنا چاہتی ہیں۔"

فرحانہ نے اتنی زیادہ تعریفیں نہیں کی تھیں۔ مگر وہ سمجھ گئی کہ قمرالنساء بیگم اپنے طور پر باتیں بنا کر جمال کو متاثر کر چکی ہے کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں فرحانہ کا احسان مند رہے۔ فرحانہ نے کہا۔

"آپ میری تعریفوں سے نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں سے پہچانے گئے ہیں۔"

"پھر بھی سفارش تگڑی ہو تو کام بنتا ہے۔ ورنہ ڈگریاں اور صلاحیتیں فٹ پاتھ پر پالش کراتی ہیں۔ بہرحال آپ کی زبان میٹھی ہے۔ اسی خوشی میں آج تمام اسٹاف کو مٹھائی کھلاؤں گا۔ یعنی وہ مٹھائی آپ کے طفیل سے آئے گی۔"

اسی وقت پہلے پیریڈ کی گھنٹی بج گئی۔ وہ اجازت لے کر اپنی کلاس کی طرف چلا گیا۔ فرحانہ بھی اپنی جماعت کی طرف چلی تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ نہ جانے کتنی صدیوں بعد کسی نے اس کی تعریف کی تھی۔ اس کی زبان کی مٹھاس کو سمجھا تھا۔ وہ ہوا میں اڑی جا رہی تھی۔

خیالوں کے جنگل میں ناچتے ہوئے مور کو کبھی اپنے بھدے پاؤں نظر آتے ہیں تو وہ ٹھٹک جاتا ہے۔ اسی طرح فرحانہ بھی بعض اوقات اپنی عمر کو سوچ کر ٹھٹک جاتی تھی۔ خود کو سمجھاتی تھی کہ عمر کو ایک مسئلہ بنا کر اس پر کڑھنا نہیں چاہئے۔ ان کے درمیان صرف تین سال کا فاصلہ ہے اور یہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ چاہنے والے اس سے بھی زیادہ فاصلہ طے کر کے اپنی پسند کو شریک حیات بنا لیتے ہیں۔

دن گزرنے لگے۔ باتیں ہونے لگیں۔ ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ کبھی کلاس میں، کبھی اسٹاف روم میں اور کبھی ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ باتوں میں مٹھاس ہوتی تھی۔ وہ قہقہے بھی لگاتے تھے۔ ایک دوسرے کی تعریفیں بھی کرتے رہے تھے۔ مگر وہ نازک سا موقعہ نہیں آیا تھا جب دل کے بھید زبان پر آجاتے ہیں۔ آنکھوں میں حجاب رہتا ہے۔ مگر اظہار محبت کے لئے حجاب کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔

پھر ایک روز چھانگا مانگا میں پک نک منائی جا رہی تھی۔ اسکول کے بچے اِدھر اُدھر

دوڑ رہے تھے۔ دو استانیاں کچھ پکوان تیار کر رہی تھیں اور ایک ٹیچر ہیڈ مسٹریس کے ساتھ ملائم گھاس پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ فرحانہ نے کھانے کی پلیٹیں قرینے سے رکھ کر دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ اسے جمال نظر نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر اسے تلاش کرنے کے لئے ایک طرف جانے لگی تھی۔

چھانگا مانگا کی ہریالی اور شادابی مرجھائے ہوئے دلوں میں بھی تازگی بھر دیتی ہے۔ فرحانہ کے دل و دماغ میں بھی تازگی تھی۔ جمال کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اسے ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی جیسے وہ اب تب میں اپنی منزل تک پہنچنے ہی والی ہو۔

وہ منزل تک پہنچ گئی۔ ایک جھاڑی کے پیچھے جمال کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر مسز اکرم کی ہنسی سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر سننے لگی۔ مسز اکرم ہنسنے کے بعد کہہ رہی تھیں۔

"جمال صاحب! آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ فرحانہ کو ایک کمسن لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ بائی گاڈ وہ تو مجھ سے بھی عمر میں بڑی ہے۔ یقین نہ ہو تو آپ کو کسی دن اسکول کی فائل سے اس کے سرٹیفکیٹ کی نقل نکال کر دکھاؤں گی۔ اس میں لکھی ہوئی تاریخ پیدائش کے مطابق اس کے انتیس برس پورے ہوگئے ہیں۔ اب تیسواں چل رہا ہے۔"

فرحانہ غم و غصہ سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے جی میں آرہا تھا کہ ابھی جا کر مسز اکرم کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دے یا پھر چیخ کر رونے لگے۔ رونے کی یاد آئی تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پھر جمال کی آواز سنائی دی۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مسز اکرم میں کسی کا سرٹیفکیٹ دیکھ کر کیا کروں؟ جبکہ میں خود ایک چور ہوں۔"

"کیا مطلب؟" مسز اکرم کی آواز میں حیرانی تھی۔

"مطلب یہ کہ میں بائیس برس کا تھا۔ اس وقت پہلی جماعت میں داخل ہوا تھا۔ میرے والدین نہیں چاہتے تھے کہ میں بائیس برس کی عمر میں میٹرک پاس کروں۔ لہٰذا انہوں نے اسکول میں میری عمر آٹھ سال لکھائی تھی۔ وہی تاریخ پیدائش کالج کے سرٹیفکیٹ میں چلی آئی ہے۔ اصل عمر کا حساب کیا جائے تو مس فرحانہ مجھ سے ایک سال چھوٹی ہیں...."

یک بیک آنسوؤں کا مزاج بدل گیا۔ فرحانہ کی آنکھوں میں وہ موتی بن کر چمکنے اور مسکرانے لگے۔ وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی عمر کا جو کانٹا برسوں سے دماغ میں چبھا

ہوا تھا اسے جمال نے نکال پھینکا تھا۔ وہ سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مسز اکرم! ایک راز کی بات بتاؤں؟"

"بتائیے!"

"بات یہ ہے کہ ایک کنواری عورت اگر بے داغ ہے اور خوب سیرت ہے تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وقت ضرور گزرتا ہے مگر اس کی پاکیزگی سولھویں برس کی طرح نئی نویلی رہتی ہے۔ میری دعا ہے کہ مس فرحانہ کو ایسا جیون ساتھی ملے۔ ایسا خوبرو' ایسا حسین' ایسا ٹوٹ کر محبت کرنے والا جسے پاکر وہ برسوں کے انتظار کی تھکن کو ایک سپنا سمجھ کر بھول جائیں۔ آپ بھی میرے ساتھ آمین کہئے......"

"او نہہ!" مسز اکرم نے بیزاری سے کہا۔ "چلئے بھوک لگ رہی ہے۔ وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔"

وہ دونوں جھاڑی کے طرف سے گزرنے لگے۔ فرحانہ دوسری طرف چھپ گئی۔ دل تو چاہتا تھا کہ فوراً ہی جمال کی نگاہوں کے سامنے چلی جائے۔ مگر اس نیک خصلت لڑکی میں اتنی شرافت تھی کہ وہ سامنے آکر مسز اکرم کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جمال عباسی اس کے لئے نیک خواہشات رکھتا ہے اور۔ اور عمر کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

☆=====☆=====☆

دکھ بیماریاں پوچھ کر نہیں آتیں۔ بس اچانک ہی حملہ کردیتے ہیں۔ فرحانہ بھی اچانک بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ اکثریوں بھی ہوتا ہے کہ بہت ساری خوشیاں بیک وقت دل میں سما جاتی ہیں۔ ایسی انجانی اور غیر متوقع خوشیاں عورت سے برداشت نہیں ہوتیں۔ کسی سے اظہار بھی نہیں کیا جاتا چپ چاپ بھی نہیں رہا جاتا۔ نہ اس کروٹ چین آتا ہے۔ نہ اس کروٹ چین ملتا ہے۔ اسی طرح کروٹیں بدلتے بدلتے مسرتوں کی حرارت سے بدن تپنے لگتا ہے۔ فرحانہ اس تپش میں مبتلا تھی جسے عرف عام میں بخار سمجھا جا رہا تھا۔

فرزانہ نے فون پر ہیڈ مسٹریس کو اطلاع دے دی تھی کہ اس کی باجی بیمار ہیں۔ کچھ روز تک اسکول نہیں آسکیں گی۔ مگر یہ کچھ روز فرحانہ کے لئے ایک طویل مدت سے کم نہ تھے۔ جمال کو دیکھے بغیر قرار نہیں آرہا تھا۔ وہ دو ہی دن کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بخار اتر گیا تھا مگر نقاہت باقی تھی۔ فرزانہ نے منع کیا کہ ایسی حالت میں اسے اسکول نہیں جانا چاہئے مگر وہ اٹھ کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"مجھے کون سا پیدل چلنا ہے۔ کار میں جاؤں گی اور ہیڈ مسٹریس سے تھوڑی دیر باتیں کرکے آجاؤں گی۔ تم ذرا جاکر ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کے لئے کہو۔"

فرزانہ کمرے سے باہر آگئی۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو ملازم نے کہا۔

"آپ ٹھہریئے بی بی جی! میں دیکھتا ہو کہ کون ہے؟"

وہ صوفہ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "جاؤ دیکھو۔ ڈرائیور سے کہنا کہ گیراج سے گاڑی نکالے۔ باجی اسکول جائیں گی۔" ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر بولا۔ "ایک صاحب ملنے آئے ہیں۔ اپنا نام سید جمال عباسی بناتے ہیں۔"

"جمال عباسی؟"

وہ حیرت سے اچھل پڑی۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئی بیرونی دروازے پر آگئی۔

جمال نے اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم۔ فرزانہ۔ تم اس کوٹھی میں رہتی ہو؟"

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے فٹ پاتھ پر رہنا چاہئے؟ تم یہاں کیسے نازل ہوگئے؟"

"بس یہ سمجھ لو کہ تمہیں یاد کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔"

"جھوٹے کہیں کے۔ اسکول میں ٹیچر کیا بن گئے ہو۔ کالج کی طرف آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کس سے میرا پتہ پوچھ کر آئے ہو؟"

"میں تمہارے ماموں جان کا پڑوسی ہوں۔ ان سے پوچھ سکتا ہوں۔ مگر میں نے یہ حماقت نہیں کی تم نے فون کرنے سے بھی منع کیا تھا کہ تمہاری کوئی باجی ہیں محبت کے خلاف لیکچر دیتی ہیں اور تمہیں سمجھاتی ہیں کہ تمہاری عمر کی لڑکیاں محبت میں دھوکہ کھاتی ہیں۔ یعنی مجھ جیسا جوان تمہارے لئے کھوٹا سکہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کھوٹا سکہ کہاں جاتا۔ کسی طرح لڑھکتا ہوا تمہارے ہی دروازے پر آگیا ہے۔"

"اف اللہ! تم فضول باتیں کئے جاؤ گے۔ یہ نہیں بتاؤ گے کہ میرا پتہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"کسی نے نہیں بتایا۔ دراصل ہیڈ مسٹریس نے ایک کوٹھی کا پتہ بتایا ہے۔ یا تو ان سے پتہ بتانے میں غلطی ہوگئی ہے۔ یا پھر میں صحیح پتہ سے بھٹک گیا ہوں۔ ویسے یہ میری

خوش نصیبی ہے کہ بھٹکنے کے باوجود اپنی صحیح منزل پر آگیا ہوں۔ شاید اسی کو جذبۂ دل کی کشش کہتے ہیں۔ بہرحال یہ بتاؤ کہ کوٹھی نمبر16 بی کہاں ہے؟"

"16 بی؟ یہ تو ہماری کوٹھی کا نمبر ہے۔ مائی گڈنس۔ اب بات سمجھ میں آئی ہے۔ کیا تم میری باجی کے اسکول میں ٹیچر لگے ہو؟"

"باجی؟" کیا مس فرحانہ تمہاری باجی ہیں؟"

"ہاں!" وہ ہنسنے لگی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

"بھئی مجھے معلوم ہوتا تو ان سے ملنے کے بہانے روز تمہیں دیکھنے آجاتا۔"

"آں!" وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "کہیں ایسی غلطی نہ کرنا۔ اگر باجی کو پتہ چل گیا کہ مجھ سے فون پر باتیں کرنے والے تم ہی ہو تو وہ پھر تمہیں بھی نصیحتیں کرنے لگیں گی کہ جاؤ میاں اپنے والدین کو یہاں رشتے کے لئے بھیجو۔"

"یہ تو بہترین نصیحت ہے۔"

"کیا خاک نصیحت ہے۔ جب تک باجی کی شادی نہیں ہوگی۔ اس وقت تک یہاں سے یہی جواب ملتا رہے گا کہ ابھی بے بی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔"

اسی وقت ڈرائنگ روم سے فرحانہ کی آواز آئی۔

"بے بی! تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

وہ ڈرائنگ روم کی طرف پلٹ کر بولی۔

"جمال صاحب سے!"

فرحانہ جیسے کھنچی چلی آئی۔ جمال کو دیکھتے ہی بیمار چہرے پر تازگی آگئی۔

"آپ۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی ہے۔ آیئے۔ تشریف لایئے۔ بے بی تم نے انہیں بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔ جمال صاحب! یہ میری چھوٹی بہن فرزانہ ہے۔ بہت ہی شریر ہے۔ دیکھئے نا؟ آپ کو بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔"

"آخر یہ بے بی ہیں۔" جمال نے مسکرا کر کہا۔ "بے بیاں نادان ہوتی ہیں۔ آنے والوں کو دروازے سے ٹالنے کی کوشش کرتی ہیں۔"

فرزانہ زیر لب مسکرانے لگی۔ فرحانہ کو مارے خوشی کے کہنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ جمال نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہیڈ مسٹریس بہت مصروف ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی عیادت کے

لئے چلا جاؤں۔ اگر وہ نہ بھی کہتیں تو میرا اخلاقی فرض ہے۔ اس لئے آگیا ہوں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

فرحانہ ذرا لجاتی ہوئی بولی۔

"آپ کے آنے سے اتنی رونق ہوگئی ہے کہ اب کسی دکھ بیماری کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔"

فرزانہ نے چونک کر اپنی باجی کو دیکھا۔ باجی کے لجانے اور جمال کی آمد پر اپنی بیماری کو بھولنے کا اظہار ایسا تھا کہ اس شرمیلے اظہار کے پیچھے کتنے ہی معنی خیز اشارے کلبلا رہے تھے۔ وہ ذرا محتاط ہو کر اپنی باجی کا جائزہ لینے لگی۔ جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرے یہاں آنے سے رونق ہوجاتی ہے تو میں روزانہ یہاں آکر آپ کی صحت یابی کی دعائیں مانگوں گا۔ بشرطیکہ آپ کی یہ فرزانہ بیگم مجھے دروازے ہی سے واپس نہ کردیں۔"

"آپ مسیحا بن کر آئیں گے۔ میری کیا مجال کہ میں راستہ روکوں۔" فرزانہ بغیر سوچے سمجھے یہ بات کہہ گئی۔ بعد میں اس نے سوچا کہ وہ جمال کو باجی کا مسیحا کہہ گئی ہے اور اتنی بڑی بات کہنے پر باجی کو ناراض ہوجانا چاہئے۔ مگر۔ مگر فرحانہ سر جھکائے شرما رہی تھی۔ دو دن تک بخار میں مبتلا رہنے کے باوجود اس کے چہرے پر بلا کا نکھار آگیا تھا۔ رخساروں پر سرخی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں حجاب تھا۔ وہ اپنے دوپٹے کے آنچل کو ایک انگلی پر لپیٹ کر کھول رہی تھی' اور فرزانہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آنچل ایک پھندے کی طرح اس کے گلے میں لپٹا جا رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر چائے لانے کے بہانے وہاں سے دوسرے کمرے میں چلی آئی۔

فرحانہ کی باتیں سن کر اور شرمیلی اداؤں کو دیکھ کر بھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی باجی اپنے مستقبل کے لئے جمال کے متعلق سوچ سکتی ہیں۔ وہ ملازمہ کو چائے کے لئے کہہ کر ایک کھڑکی کے پاس پردے کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں صاف نظر آرہے تھے اور ان کی باتیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

فرحانہ بہت کم باتیں کر رہی تھی لیکن ایک آدھ بار جو کچھ بھی اس نے کہا۔ اس کی گہرائی تک فرزانہ ڈوبتی چلی گئی۔ جمال جس انداز سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ فرحانہ کے دلی جذبات کو نہیں سمجھ رہا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی

ہوتی ہیں جو اپنے ماحول اور مزاج کے مطابق سمجھی جاتی ہیں۔ جمال کے من مزاج پر فرزانہ چھائی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ فرحانہ کی باتوں سے ایسے ویسے معنی و مطلب اخذ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نادانستگی میں زندہ دلی کا ثبوت دیئے جا رہا تھا۔

فرزانہ کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ باجی کو دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔

”میرے مالک! یہ کیا ہوگیا؟ باجی کس راستے پر بھٹک رہی ہیں؟ میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟ سمجھانا تو دور کی بات ہے۔ میں ان کے سامنے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کر سکتی۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ایک بہن دوسری بہن کے سامنے ایک ہی محبت کا دکھڑا رونے بیٹھ جائے۔ آہ! یہ تقدیر ہمیں کس مقام پر لے آئی ہے؟“

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس کی محبت کے راستے میں کوئی دوسری آنا چاہتی تو ابھی دو ٹوک فیصلہ ہو جاتا۔ وہ جمال سے صاف صاف کہہ دیتی کہ دیکھو! وہ چپکے چپکے تمہاری ذات سے دلچسپی لے رہی ہے۔ تم کھل کر فیصلہ سنا دو۔ مگر وہ جمال سے باجی کے متعلق کیسے کہہ سکتی تھی؟

اور ایسی باجی جو برسوں سے ناکامیوں کا منہ دیکھتی آ رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی مدت گزر گئی تھی۔ اس نے باجی کے چہرے پر آج جیسی شگفتگی اور رونق نہیں دیکھی تھی۔ حالات کی ستائی ہوئی' طویل انتظار سے مرجھائی ہوئی اس بدنصیب کو ایک نئی زندگی مل رہی تھی۔ نئے خواب اور نئی مسرتیں مل رہی تھیں۔ کیا وہ اپنی باجی کی مسرتوں کو خود غرضی سے کچل سکتی تھی؟

نہیں۔ کبھی نہیں۔ باجی کو ایک تنکے کا سہارا ملا تھا۔ وہ اس ننھے سے' کمزور سے سہارے کو چھین کر ان کا دل نہیں توڑ سکتی تھی۔

وہ اپنے بستر پر آ کر اوندھے منہ گر پڑی۔ پھر آنسو اور قہقہے گڈمڈ ہونے لگے۔

پہلے جو آنسو بہاتی تھی' وہ ڈرائنگ روم میں قہقہے لگا رہی تھی اور جو کبھی مترنم ہنسی کا سرچشمہ تھی' وہ آنسوؤں میں بھیگ رہی تھی۔

☆======☆======☆

جمال ہر دوسرے تیسرے دن وہاں آنے لگا تھا۔ فرزانہ خوب سمجھتی تھی کہ وہ محض اسے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے آتا ہے اور فرحانہ اپنے اندھے یقین سے بہل رہی

تھی کہ جمال صرف اس سے ملاقات کرنے آیا کرتا ہے۔ اس دوران اس کی امی اور ابو سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس کی قدر کرتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ قدر اس لئے کرتے تھے کہ جمال بھی ان کی طرح عباسی تھا اور پسند اس لئے کرتے تھے کہ ایسے لڑکے عنقا ہو گئے تھے۔ یعنی آج کل کی مروجہ زبان میں آؤٹ آف مارکیٹ ہو گئے تھے۔ مدتوں بعد جمال عباسی ان کے دروازے پر آیا تھا۔ اس لئے وہ بے حد خوش تھے۔

لیکن فرزانہ اس سے کترا رہی تھی۔ کلیجے پر صبر کی سل رکھ کر اپنی باجی کی راہیں روشن کر رہی تھی۔ جمال وہاں آتا تو وہ دوسرے کمروں میں چھپتی پھرتی۔ اس کی باجی یا امی آوازیں دیتیں تو وہ سر جھکا کر آتی جمال سے نظریں چراتی' دو چار باتیں ان سے کرتی' پھر کسی کام کا بہانہ کر کے واپس چلی جاتی تھی۔ یہ دوری کا ناٹک وہ کب تک کھیل سکتی تھی' اسے دیکھ کر' اس کی آواز سن کر بھی دور رہتے ہوئے دل روتا تھا۔

ایک دن فرحانہ نے اس کے کمرے میں آ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے بے بی! آجکل تم چپ چپ سی رہتی ہو؟“

”آں۔ کچھ نہیں۔ بس یونہی۔ امتحان سر پر ہے۔ اس لئے چپ چاپ اسٹڈی کرتی رہتی ہوں۔“

فرحانہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے دوپٹے کے آنچل سے اس طرح کھیل رہی تھی کہ اس کا اندرونی اضطراب آپ ہی آپ ظاہر ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے بڑی مشکلوں سے ایک سوال کیا۔

”بے بی! وہ۔ جمال صاحب تمہیں کیسے لگتے ہیں؟“

فرزانہ اس غیر متوقع سوال سے بوکھلا گئی۔ اس سے پوچھا جا رہا تھا کہ جمال کیسا لگتا ہے۔ ارے اس کے وجود کا ذرہ ذرہ کہتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ صرف وہی ہے۔ وہی جو ہر سانس کے ساتھ دل کی دھڑکنوں تک پہنچتا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو محبت کا لفظ معنی سے محروم ہو جاتا۔

وہ جواب میں بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ مگر اس وقت وہ سوال آزمائش بن کر آیا تھا۔ اس کے جواب پر ایک بہن کے مستقبل کا انحصار تھا۔ وہ ہولے سے لہجے میں تھراتے ہوئے بولی۔

”وہ۔ مجھے تو۔ ذرا اچھا نہیں لگتے.....“

یہ کہہ کر وہ جلدی سے کھلی ہوئی کتاب پر جھک گئی۔ تاکہ چہرہ اس کے جھوٹ کو ظاہر نہ کرے۔ فرحانہ کچھ حیرانی سے اور کچھ ناراضگی سے بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ وہ کیوں اچھے نہیں لگتے؟ کیا برائی دیکھی ہے تم نے؟ پتہ نہیں تمہیں ان سے کیا دشمنی ہے؟ وہ آتے ہیں تو تم ادھر کا رخ نہیں کرتی ہو۔ سچ سچ بتاؤ بے بی! اگر تم نے ان میں کوئی خرابی دیکھی ہے تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ دودھ کا جلا' چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میں۔ میں سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ تم نے مجھے ڈرا دیا ہے۔"

وہ کتاب سے نظریں اٹھاتے ہوئے بولی۔

"آپ خواہ مخواہ ڈر گئی ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ان میں کوئی عیب ہے۔ میں نے تو صرف اچھے لگنے یا نہ لگنے کی بات کہی ہے۔ آپ اپنوں یا غیروں سے پوچھتی پھریں گی تو ایک جواب دوسرے سے مختلف ہوگا۔ زندگی کے اس مسئلے میں اپنی پسند کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ پرانی کہاوت ہے کہ جسے اپنی نظر اچھا کہتی ہے' وہی دنیا کا حسین ترین انتخاب ہوتا ہے۔"

"ارے تم تو بڑی فلسفیانہ باتیں کر رہی ہو۔ مگر اچھی باتیں کر رہی ہو۔ یہ درست ہے۔ اپنی پسند کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ آگے نصیب میں کیا لکھا ہے' یہ کوئی نہیں جانتا۔"

"ہاں باجی! آگے کیا لکھا ہے کوئی نہیں جانتا۔ ویسے آپ یہ تو جانتی ہوں گی کہ جمال صاحب اپنے دماغ میں آپ کے لئے کیا لکھ رہے ہیں؟"

فرحانہ سر جھکا کر تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

"وہ جتنے زندہ دل ہیں' اتنے سنجیدہ بھی ہیں۔ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح بے باکی سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ مجھے بھی یہ چھچھوراپن اچھا نہیں لگتا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لئے ذہانت کی ضرورت ہے۔ سو میں سمجھ رہی ہوں' اور یہ بات موٹی عقل سے بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ بار بار مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ یہاں کسی اور سے تو رشتے داری نہیں ہے نا۔ یہ تو تم بھی سمجھتی ہو۔"

"آں۔ ہاں۔ سمجھتی ہوں۔"

"کیا بات ہے تم میری باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی ہو۔ اوہ سوری' میں بھول گئی تھی کہ تم امتحان کی تیاری کر رہی ہو۔"

اس نے اپنی باجی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کے مستقبل سے پوری دلچسپی ہے۔ مگر آپ نے زندگی میں بڑے زخم کھائے ہیں۔ اس گھر میں آپ کے لئے کتنے ہی خواب آئے۔ مگر تعبیر ایک نہ آئی۔ میں آپ کے پچھلے دکھوں سے ڈرتی ہوں۔ میں اس وقت تک خوشی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ جب تک جمال صاحب یہاں آپ کا رشتہ مانگنے نہیں آئیں گے۔ اتنی طویل خاموشی اچھی نہیں ہوتی باجی۔ انہیں دستور کے مطابق امی اور ابو کے سامنے بات چھیڑنی چاہیئے۔"

فرحانہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم بہت اچھی ہو۔ بہت سمجھدار ہو۔ میں بھی عجیب ہوں۔ پھر خوابوں اور خیالوں سے بہلنے لگی ہوں۔ میں کل اسکول جاؤں گی تو باجی سے بات کروں گی۔ ایک وہی ہیں جو اس بات کو آگے بڑھا سکتی ہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور کچھ دل برداشتہ ہو کر کمرے سے چلی گئی۔

دوسری صبح فرزانہ کالج کے گیٹ پر پہنچی تو جمال اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اس کے ہاتھ کے اشارے پر کار روک دی۔ اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کہا۔

"باہر آؤ۔ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"کالج کا وقت ہوگیا ہے۔ تم شام کو گھر آؤ گے تو وہیں باتیں ہوں گی۔"

اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"اب میں تمہارے گھر کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی اس جگہ نہیں جاؤں گا جہاں تمہاری آنکھیں میرا انتظار نہ کرتی ہوں۔"

کتنی محبت اور دیوانگی تھی اس کی باتوں میں؟ وہ موم کی طرح پگھل گئی۔

کبھی موم۔ کبھی پتھر۔ باجی کی یاد آتے ہی اس کا سر جھک گیا۔ وہ ہولے سے بولی۔

"جمال! میں بہت پریشان ہوں میرا راستہ نہ روکو....."

"میں بھی بہت پریشان ہوں۔" وہ پچھلی سیٹ پر آکر اس کے برابر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ "مال روڈ کی طرف چلو۔"

کار بیک ہو کر مال روڈ کی طرف جانے لگی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ فرزانہ کے لئے کترا کر نکل جانے کا کوئی راستہ نہ تھا اور جمال ڈرائیور کی موجودگی میں کچھ کہنا نہیں

روتا بھی آتا ہے۔ تمہاری باجی بھی روئیں گی۔ پھر وقت کا کوئی صابر لمحہ ان کے آنسو پونچھ کر گزر جائے گا۔"

"تم کتنی سنگدلی سے یہ باتیں کہہ رہے ہو جمال! کیا میں باجی کے آنسو دیکھ سکوں گی؟"

"جذبات سے نہیں عقل سے سوچو۔ انہیں کسی طرح بتاؤ کہ میں تمہیں، صرف تمہیں چاہتا ہوں۔"

"میں نہیں بتا سکتی۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا بڑی بہن سے ایسی باتیں کہتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟"

"اچھی بات ہے میں ان سے کہوں گا۔"

"نہیں جمال! ان کے منہ پر ایسی بات نہ کہنا۔ انہیں اپنی توہین کا احساس ہو گا۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم کہو۔ میرا کہنا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ ایک دن اسی گھر میں میری امی تمہیں بہو بنانے آئیں گی۔ اس سے پہلے مجھے کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے جس سے تمہارے گھر والوں کی دل شکنی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم انہیں ایک خط لکھو۔ اس میں پوری تفصیل بیان کرو کہ ہم دو سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور بہت پہلے ہی ایک زندگی گزارنے کا عہد کر چکے ہیں۔ جو باتیں تم روبرو نہیں کہہ سکتیں وہ تحریر کے ذریعہ نہایت آسانی سے کہہ دو گی۔"

یہ مشورہ کسی حد تک قابل قبول تھا۔ فی الحال یہی ایک راستہ نظر آ رہا تھا کہ خط لکھ کر فرحانہ کی غلط فہمی دور کی جائے۔ فرزانہ نے کہا۔

"تم کہتے ہو تو میں خط لکھوں گی۔ مگر ابھی تم نے کہا ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیئے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ میرے خط کا رد عمل حوصلہ شکن بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ عورت ایک جائز بات کو تسلیم کرنے کے بجائے جھنجلا جاتی ہے۔ آج سے بہت پہلے باجی نے میری محبت کی مخالفت کی تھی اب وہی مخالفت رنگ لا سکتی ہے۔ یا پھر یہ بھی ہو گا کہ وہ اپنی ناکامی اور توہین کی برداشت نہیں کریں گی اور کوئی احمقانہ قدم اٹھائیں گی۔ زندگی پر موت کو ترجیح دیں گی۔ ضدی اور جذباتی عورتیں اکثر خودکشی کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ کیا ہم ان کی موت کا تماشہ دیکھ سکتے ہیں؟"

"نہیں دیکھ سکتے۔ ہم یہ تماشہ نہیں ہونے دیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہاری باجی

خودکشی کا خیال اپنے دل میں نہیں لائیں گی۔ اگر وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں گی تو ہم انہیں روک دیں گے۔"

"کیسے روکیں گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ہمیں اطلاع دے کر ایسا قدم اٹھائیں گی؟"

"اوہ فرزانہ! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارا خط پڑھنے کے بعد ان کی آنکھوں سے، ان کی باتوں سے اور ان کی حرکتوں سے تم معلوم کر سکتی ہو کہ خط کا ردِ عمل کیا ہو رہا ہے۔ اگر وہ بہت زیادہ مایوس اور زندگی سے بیزار نظر آئیں گی تو میں انہیں سمجھاؤں گا۔"

"انہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا جمال! جو مریضہ دوا سے اچھی ہو سکتی ہے۔ تم اس کے لئے دعا سے کام لینا چاہتے ہو۔ میں کچھ نہیں جانتی تم مجھے یقین دلاؤ کہ اگر دعا سے کام نہ بنا تو تم دوا بن جاؤ گے۔"

جمال کا سر جھک گیا۔ وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا فرزانہ نے کہا۔

"میں تمہارے مشورے پر عمل کر رہی ہوں۔ اگر ناکامی ہوئی تو کیا تم میرے مشورے پر عمل نہیں کرو گے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

"میں تمہاری باجی کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا۔ تم کوشش کرو کہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ انہیں کوئی اچھا شریکِ حیات مل جائے۔ اگر ہم دونوں کو ناکامی ہوئی تو میں اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ان کے لئے دوا بن جاؤں گا۔"

ایک ساعت کے لئے فرزانہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اس فیصلے کے لئے اس نے خود ہی جمال کو مجبور کیا تھا اور اب خود ہی دل برداشتہ ہو کر سانس لینا بھول گئی تھی۔ ایسا چند ساعتوں کے لئے ہوا۔ پھر وہ جبراً مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ آنسو بھرے مستقبل کا پیش خیمہ تھی۔

☆=====☆======☆

رات گزر رہی تھی اور فرزانہ میز پر جھکی ہوئی اپنی باجی کو خط لکھنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ خط لکھنا بڑی بات نہیں ہے۔ مگر خط کا مضمون ایسا ادق تھا کہ بات بنائے نہیں بن رہی تھی۔ کتنے ہی کاغذ کے پرزے ردی کی ٹوکری میں چلے گئے تھے۔ دماغ تھک رہا تھا۔ قلم رک رہا تھا لیکن ایک خط مکمل نہیں ہو رہا تھا۔

چاہتا تھا۔ ہوٹل شیزان کے سامنے کار رکوا کر وہ دونوں باہر آئے۔ پھر اسی طرح خاموشی سے چلتے ہوئے ہوٹل کے ایک کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ جمال نے ٹھنڈی بوتلوں کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

"فرزانہ! میں تمہاری باجی کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ہیڈ مسٹریس نے ان کی پچھلی زندگی کے متعلق بہت کچھ بتا دیا ہے۔ پھر ان کے چہرے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت دکھی ہیں۔ وہ عمر کی ایسی منزل پر پہنچ گئی ہیں کہ اب ان کی شادی ہو جانا چاہیئے' اور وہ اتنی اچھی ہیں۔ اتنی اچھی ہیں کہ کوئی بھی شریف انسان بخوشی اپنی شریکِ حیات بنا لے گا۔ کیوں' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"ہاں جمال! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم۔ تم باجی کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

جمال کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ آگئی۔

"میں وہی کر سکتا ہوں' جو میرے اختیار میں ہوگا۔ میں نادان نہیں ہوں۔ سمجھ رہا ہوں کہ تم آج کل مجھ سے کیوں کترا رہی ہو۔ جب تک تم میرے قریب تھیں۔ میں نے تمہاری باجی کی باتوں کو کبھی غور سے نہیں سنا۔ تم دور ہونے لگیں تو مس فرحانہ کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ کل بھی تم میرے سامنے نہیں آئیں تو میں سمجھ گیا کہ تم اپنی باجی کے لئے بہت بڑی قربانی دینے کا فیصلہ کر چکی ہو۔"

ان کے سامنے گلاس اور ٹھنڈی بوتلیں آگئیں۔ بیرا واپس چلا گیا تو اس نے کہا۔

"میں قربانی کے اس عظیم جذبے کی قدر کرتا ہوں اور فخر کرتا ہوں کہ مجھے تم جیسی ذہین اور دردمند دل رکھنے والی لڑکی کی محبت حاصل ہے۔ میں بھی قربانی دے سکتا ہوں فرزانہ! ہم اپنے لئے نہیں' تمہاری باجی کی خوشی کے لئے زندہ رہ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں تمہیں ایک ضروری بات بتا دوں کہ ایک بار ہم پک نک منانے گئے تھے۔ میں مسز اکرم کے ساتھ گھومتا ہوا ذرا دور نکل گیا تھا۔ ایک جھاڑی کے قریب ہم دونوں رک گئے اور وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جھاڑی کے دوسری جانب مجھے نارنجی رنگ کے لباس کی جھلک نظر آئی۔ مس فرحانہ اس رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چھپ کر ہماری باتیں سن رہی ہیں۔

اس وقت مسز اکرم اپنی عادت سے مجبور ہو کر مس فرحانہ کی برائی کر رہی تھیں۔ میرے سامنے ان کی عمر کا حساب کر رہی تھیں ۔ یعنی یہ جتا رہی تھیں کہ مس فرحانہ مجھ

سے عمر میں بھی بڑی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ باتیں سن کر ان کا دل ٹوٹ جائے۔ کیونکہ عورت ہر صدمہ برداشت کر لیتی ہے مگر بھاگتی ہوئی عمر کا صدمہ نہیں سہہ سکتی۔ میں نے مسز اکرم کی زبان بند کرنے کے لئے ایک جھوٹ کہا کہ میرے سرٹیفکیٹ میں میری عمر کم لکھائی گئی ہے۔ اصل عمر کے لحاظ سے مس فرحانہ مجھ سے چھوٹی ہیں اور یہ کہ کوئی بھی کنواری لڑکی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ یعنی مس فرحانہ کی دلجوئی کے لئے جو کچھ بھی کہہ سکتا تھا وہ کہہ گیا اور مسز اکرم کو ساتھ لے کر جھاڑی کے دوسری طرف سے چلا گیا۔ تاکہ مس فرحانہ پر یہ بات نہ کھلے کہ میں انہیں دیکھ چکا ہوں اور وہ ساری باتیں ان کی دلجوئی کے لئے کہتا رہا ہوں۔

مگر اس دلجوئی کو مس فرحانہ دوسرے انداز میں لے رہی ہیں۔ وہ نہیں جانتیں کہ میں واقعی ان سے تین سال چھوٹا ہوں۔ فرزانہ! ہم ایک حد میں رہ کر قربانی دے سکتے ہیں لیکن اس حد سے آگے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے والدین پرانے خیالات کے حامل ہیں۔ وہ ستائیس برس کے بیٹے کے لئے تیس برس کی بہو لانا کبھی پسند نہیں کریں گے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنے والدین سے جھگڑا کروں؟ تم کتنی قربانیاں چاہتی ہو؟ تمہیں چھوڑ دوں۔ اپنے والدین کو چھوڑ دوں۔ اپنے گھر سے بے گھر ہو جاؤں۔ تمہاری یاد میں ساری زندگی سلگتا رہوں۔ بولو تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ جمال جو کچھ کہہ رہا تھا' درست کہہ رہا تھا۔ وہ یہ احمقانہ مشورہ نہیں دے سکتی تھی کہ اس کی باجی کے لئے وہ ساری دنیا سے منہ موڑ لے۔ جمال نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"ہمیں تصویر کے ایک ہی رخ کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ دوسرے رخ پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کیا ہم مس فرحانہ کی غلط فہمی دور نہیں کر سکتے ہیں؟"

بہت دیر کے بعد وہ آہستگی سے بولی۔

"پہلے میں نے سوچا تھا۔ پھر یہ سوچ کر گھبرا گئی کہ اس بار باجی کا دل ٹوٹے گا تو وہ جیتے جی مر جائیں گی۔"

"تم باجی سے بہت زیادہ محبت کرتی ہو۔ اس لئے ایسا سوچتی ہو۔ ورنہ عورت اس سے بھی گہرے صدمات سہہ کر زندگی گزارتی ہے۔ ہر نئے زخم پر تکلیف پہنچتی ہے۔

ٹیبل لیمپ کی محدود روشنی میز پر پھیلی ہوئی تھی۔ کورس کی کتابوں پر ماہنامہ "پاکیزہ" کا تازہ شمار رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اہم مسئلہ میں اس طرح الجھی ہوئی تھی کہ اس رسالے کو کھول کر دیکھنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ جب تک "پاکیزہ" نگاہوں کی سامنے رہے گا وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکے گی۔

یہ بات نہیں ہے اپنے مسئلے کو بھول کر پہلے پاکیزہ کی ورق گردانی کو دل مچل رہا تھا۔ کوئی اپنے مسائل پر والدین کو محض ایک رسالے کی خاطر نہیں بھول سکتا۔ ایک وہ لفظ "پاکیزہ" اس کے دماغ کو مسلسل ٹھونکے دے رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ رشتوں کی پاکیزگی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ جو شرم و حیا دو بہنوں کے درمیان ہوتی ہے اسے مجروح نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا وہ لاکھ کوشش کرے۔ تب بھی اپنی بڑی بہن کو یہ نہیں لکھ سکتی کہ وہ جمال کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگی کہ کیا کرے؟

فی زمانہ تعلیم یافتہ لڑکیاں اتنی آزاد اور بیباک ہوگئی ہیں کہ اپنی محبت اور شادی کے مسائل پر والدین اور دیگر بزرگوں سے روبرو گفتگو کرلیتی ہیں۔ دیکھا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لڑکیوں کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ پوری آزادی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکیں۔ لیکن جہاں ایک انار دو بیمار کا مسئلہ آجائے۔ خصوصاً ایسے وقت جب دو سگی بہنیں ہوں اور ایک ہی مسیحا کی مریضہ ہوں اور ایک دوسرے کو غلط فہمیوں سے دور کرنا چاہتی ہوں تو وہاں قلم رکتا ہے، زبان لڑکھڑاتی ہے۔ کیونکہ عورت ایسے موقعوں پر اپنی فطری حیا کو نہیں بھولتی۔

بہت دیر تک وہ سوچتی رہی اور سمجھتی رہی کہ وہ اپنی باجی کو براہ راست خط نہیں لکھ سکے گی۔ کوئی دوسری تدبیر کرنی ہوگی۔ ایسی تدبیر کہ نہ قلم حرکت میں آئے اور نہ زبان کو جنبش ہو اور حقیقت حال باجی پر واضح ہوجائے۔

وہ "پاکیزہ" ہاتھوں میں لے کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کی نگاہیں صفحات پر تھیں اور ذہن اپنے مسئلے کی تاریکی میں جھانک رہا تھا۔ پھر اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اگر اس مسئلے کو ایک کہانی بنا کر پیش کیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔ باجی اسے

کہانی سمجھ کر پڑھیں گی اور اس میں اپنی زندگی کی تمام جھلکیاں دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہوجائیں گی کہ وہ جمال کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہیں۔

یہ تدبیر اچھی تھی لیکن اس میں کامیابی کا انحصار "پاکیزہ" پر تھا کیونکہ اس کی باجی اس رسالے کی مستقل خریدار تھیں اور اس میں شائع ہونے والی ہر کہانی کو بڑی لگن سے پڑھتی تھیں۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اگر اس کی لکھی ہوئی کہانی بھی اس رسالے میں شائع ہوجائے تو وہ یقیناً باجی کی نظروں سے گزرے گی۔ کہانی لکھنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اپنے کالج کے رسالے میں بارہا اس کی کہانیاں شائع ہوچکی تھیں کالج کا سہ ماہی رسالہ دو ماہ بعد شائع ہونے والا تھا۔ اپنی کہانی کی اشاعت کے لئے دو ماہ تک انتظار کرنا سراسر نادانی تھی۔ ایک "پاکیزہ" کے ذریعے وہ اپنی باجی کو سوچنے سمجھنے اور ایک دانشمندانہ فیصلے پر مجبور کرسکتی تھی۔

یہ سوچ کر وہ لکھنے بیٹھ گئی۔ اس امید پر کہ اس رسالے میں نئی لکھنے والیوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ کہانی کا آغاز مشکل نہ تھا۔ انجام تک پہنچنا بھی آسان تھا۔ کیونکہ وہ خود اس کہانی کے واقعات سے گزرتی آئی تھی۔ اس کے تمام جیتے جاگتے کردار اس کے آس پاس تھے۔ صرف اتنی سی تبدیلی کی گئی تھی کہ اس کے نام اور مقامات فرضی لکھے جارہے تھے۔ یعنی اپنا نام شبانہ' باجی کا نام رضوانہ اور جمال کا نام جمیل رکھ دیا تھا۔ واقعات من و عن وہی تھے۔ لہٰذا کہانی کے نشیب و فراز بنتے چلے گئے۔

دو راتیں جاگنے کے بعد کہانی مکمل ہوگئی۔ فرزانہ کی نظروں میں وہ کہانی شاہکار تھی۔ دوسروں کے لئے شاہکار نہ سہی' پھر بھی قابل اشاعت ضرور تھی۔ اسے مزید قابل اشاعت بنانے کے لئے مدیرہ کے نام خط لکھنا ضروری تھا۔ خط لکھنا' کہانی لکھنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے ذہانت اور انسانی نفسیات کی سوجھ بوجھ ضروری ہوتی ہے کیونکہ خط میں اپنی کہانی کی تعریف سے زیادہ مدیرہ کی مداح سرائی لازمی ہوتی ہے۔

اس نے لکھنا شروع کیا۔

"محترمہ ساجدہ معراج صاحبہ....."

وہ لکھتے لکھتے رک گئی۔

یہ "معراج صاحبہ" کھٹک رہا تھا۔ حالانکہ اس نے ساجدہ کے لئے صاحبہ لکھا تھا۔ پھر

اس نے سوچا کہ ساجدہ صاحبہ لکھنے میں وہ اپنائیت نہیں ہے جو باجی لکھنے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نے اور گہری اپنائیت کے لئے لکھا۔

"میری پیاری ساجدہ باجی۔ اللہ آپ اتنا خوبصورت رسالہ کیسے شائع کرلیتی ہیں۔ میں ہرماہ بے چینی سے پاکیزہ کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔"

اتنا لکھنے کے بعد اس نے سوچا کہ ساجدہ باجی سے زیادہ "پاکیزہ" کی تعریف ہوگئی ہے۔ عورت اپنے سامنے کسی دوسری چیز کی تعریف گوارا نہیں کرتی۔ لہٰذا عورت کی تعریف ہونی چاہیئے۔

"باجی! آپ کا ناول پاکیزہ اتنا دلچسپ ہے کہ میں ہررات سونے سے پہلے اسے پڑھتی ہوں۔ اگر نہ پڑھوں تو نیند نہیں آتی۔ سچ سچ بتایئے' اتنے اچھوتے خیالات کہاں سے چرا کرلاتی ہیں۔ کہیں الہام تو نہیں ہوتا ہے۔"

تعریف کے سلسلے میں نادرہ گیلانی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے لکھا۔

"نادرہ صاحبہ بھی خوب لکھتی ہیں۔ خاص طور پر وہ انٹرویو بہت اچھا کرلیتی ہیں۔ ہوسکے تو ان کا بھی ایک انٹرویو لے کر شائع کیجئے۔ ہم جاننا چاہتی ہیں کہ وہ کہاں سے آئی ہیں؟ بہنوں کی محفل میں لکھنے والیاں زیادہ تر ان کی تعریفیں کرتی نظر آتی ہیں۔ میرے خط کا یہ ٹکڑا بھی بہنوں کی محفل میں شائع کردیجئے۔ نوازش ہوگی۔

اس خط کے ساتھ ایک سچی کہانی ارسال کررہی ہوں اسے میں نے بڑی محنت سے لکھا ہے۔ یہ کہانی آپ کی فوری توجہ کی مستحق ہے۔ اس کے کردار شبانہ' رضوانہ اور جمیل آج بھی زندہ ہیں۔ اگر یہ کہانی آئندہ ماہ شائع کردی گئی تو ان کرداروں کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ خصوصاً شبانہ اور جمیل آپ کو تاحیات دعائیں دیتے رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ واپسی ڈاک سے اس خط کا جواب دیں گی۔ فقط۔ آپ کی ایک پرستار۔ فرزانہ بشارت...."

خط مکمل کرنے کے بعد ایک کمی کا احساس ہوا کہ ساجدہ معراج کا دل جیتنے کے لئے سبین کا ذکر نہیں آیا ہے۔ اس نے فوراً "نوٹ" کے طور پر لکھا۔

"سرورق پر سبین کی تصویر اتنی پیاری تھی کہ بے اختیار اسے چوم لیا۔ ہماری سبین کی ایک اور رنگین تصویر شائع کیجئے۔ ورنہ جھگڑا ہوجائے گا...."

اب صحیح معنوں میں خط مکمل ہوگیا تھا۔ اس نے دوبارہ اسے پڑھا تو اسے احساس

ہوا کہ اس نے صدق دل سے کسی کی تعریف نہیں کی ہے۔ صرف خوشامدیں کی ہیں۔ اس کی زندگی کے واقعات سچے تھے اس کی لکھی ہوئی کہانی سچی تھی لیکن اسے شائع کرنے کے لئے تعریفوں کا ملمع چڑھایا گیا تھا۔

فرزانہ نے سنا تھا کہ جہاں صلاحیتوں سے کام نہیں چلتا' وہاں خوشامدوں سے کام نکل جاتا ہے۔ اس کہانی کا شائع ہونا بے حد ضروری تھا۔ اس لئے وہ زندگی میں پہلی بار ایک غلط روش پر چل نکلی تھی۔

کہانی اور خط پوسٹ کرنے کے بعد وہ اس بے چینی سے انتظار کرنے لگی جیسے دوسرے ہی لمحے اس کی مرضی کے عین مطابق جواب آجائے گا۔ مگرایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی جواب نہیں آیا۔

جمال کو اس نے بتادیا تھا کہ براہ راست اپنی باجی کو خط نہ لکھ سکی۔ بالواسطہ ایک کہانی کی صورت میں حقیقت کو واضح کرنا چاہتی ہے۔ وہ کہانی انشاء اللہ پاکیزہ کے آئندہ شمارے میں شائع ہوجائے گی۔ آئندہ شمارہ کب اس کی باجی تک پہنچے گا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ رسالہ کبھی وقت سے پہلے شائع ہوجاتا تھا اور کبھی کسی مجبوری کی بنا پر تاخیر سے ملتا تھا۔ ادھر جمال پریشان تھا۔ ہیڈ مسٹریس ڈھکے چھپے انداز میں اسے شادی کے مشورے دیا کرتی تھیں۔ جمال بڑی خوبصورتی سے انہیں ٹال رہا تھا۔ فرحانہ کو اس طرف سے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ پھروہ کچھ فکر مند رہنے لگی تھی۔ شاید اس لئے کہ جمال نے واضح طور پر کوئی فیصلہ نہیں سنایا تھا۔

فرزانہ روزانہ کالج سے واپس آکر پوچھتی تھی کہ پاکیزہ کا تازہ شمارہ یا کوئی خط آیا ہے؟ جواب۔ "نہیں۔" میں ملتا تھا اور وہ جھنجلا کر رہ جاتی تھی۔ انہی دنوں اس نے اپنے والدین اور ماموں جان کو آپس میں سرجوڑ کر باتیں کرتے دیکھا۔ باتوں کے دوران ایک آدھ بار فرحانہ اور جمال کا نام بھی سنا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ سمجھنے میں دیر لگی کہ فرحانہ کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کی جارہی ہے لیکن لڑکا کون ہے؟ جمال یا کوئی اور؟ وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی کہ جب تک لڑکے والے رشتہ مانگنے نہ آئیں۔ اس وقت تک شادی کی باتیں خواب ہوتی ہیں لڑکی والے محض خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔

ایک روز کالج سے واپس آئی تو اس کی امی نے بتایا کہ اس کے نام کراچی سے خط

آیا ہے۔ انہوں نے وہ خط اس کی میز پر رکھ دیا ہے۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ میز پر کھلا ہوا لفافہ رکھا تھا۔ اس نے لفافے سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اسے کھول کر پڑھنے لگی۔

بہن فرزانہ بشارت!

جس محنت اور سوجھ بوجھ سے آپ نے خط لکھا ہے اگر اسی لگن سے کہانی لکھتیں تو وہ یقیناً اشاعت کے قابل ہو جاتی۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ نئی لکھنے والیاں اپنے قلم کا سارا زور تعریفی خطوط لکھنے میں صرف کرتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر انسان اپنی تعریفیں سن کر خوش ہوتا ہے۔ ہم بھی خوش ہو جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہوں؟ ہم بھی تو محض اپنی محنتوں کا صلہ چاہتی ہیں۔ میں "پاکیزہ" ادارت پر ناز کرتی ہوں اور سبین جیسی حسین تخلیق پر فخر کرتی ہوں لیکن پاکیزہ کے لئے کہانیوں کا انتخاب کرتے وقت رشتوں' محبتوں اور تعریف کے تمام کمزور پہلوؤں کو بالائے طاق رکھ دیتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ کا معیار بلند سے بلند ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کی کہانی میں بہت سی فنی کمزوریاں ہیں۔ جنہیں گنوانے بیٹھوں تو اتنی دیر میں خود ایک کہانی لکھ ڈالوں۔ آپ کی جس بات نے مجھے یہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ یہ ہے آپ اس کہانی کے ذریعہ کسی رضوانہ' شبانہ اور جمیل کے ایک اہم مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہیں۔ بے شک پاکیزہ میں ایسی ہی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ جن سے بے شمار خواتین کی راہیں روشن ہوتی جاتی ہیں چونکہ آپ کی کہانی فنی کمزوریوں کے باعث ناقابل اشاعت ہے۔ اس لئے میں اپنے طور پر ان کرداروں کو مشورہ دیتی ہوں۔ آپ خلوص دل سے ان کے کام آنا چاہتی ہیں تو میری یہ تحریر ان تک پہنچا دیجئے۔

ہمارے ملک میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک گھر میں کئی بہنیں ہوتی ہیں اور ان کے رشتے کے لئے بڑی تلاش کے بعد ایک لڑکا ہاتھ آتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک انار اور سو بیمار والی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انصاف اور اصول سے دیکھا جائے تو سب سے پہلے بڑی بہن کا رشتہ ہونا چاہیئے لیکن بعض حالات میں اس اصول کو بدلنا پڑتا ہے۔ رضوانہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے جمیل بھی وہاں ایک ٹیچر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔

جمیل کو اس سے ہمدردی ہے مگر رضوانہ اس ہمدردی کو محبت سمجھ کر اسے اپنے مستقبل کا ساتھی تصور کرنے لگتی ہے۔ رضوانہ جیسی مظلوم ہستی واقعی ہمدردی کی مستحق ہے لیکن بعد میں یہ راز کھلتا ہے کہ چھوٹی بہن شبانہ فون پر جس سے باتیں کیا کرتی تھی اور کالج کے گیٹ پر ملاقاتیں کیا کرتیں تھی۔ وہ یہی جمیل ہے۔ جس سے رضوانہ نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ زندگی کے اس موڑ پر رضوانہ کو اس حقیقت کا علم ہونا چاہیئے کہ اس کے اسکول کا ٹیچر اور اس کی عیادت کو آنے والا جمیل برسوں پہلے ہی شبانہ کی زندگی میں آچکا ہے۔ کیونکہ برسوں کا ذہنی اور جذباتی رشتہ توڑا نہیں جاسکتا اور ایسے میں جبکہ جمیل کا اپنا انتخاب اور پسند شبانہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ رضوانہ کو اپنی زندگی میں بہت سے دکھ ملے ہیں۔ اس لئے یہ ناکامی کا چرکہ ناقابل برداشت ہو سکتا ہے۔

رضوانہ ذہین اور خوددار ہے۔ ایسی خوددار کہ جس افسر سے محبت کرتی تھی۔ اسے ایک لالچی اور کاروباری کے روپ میں دیکھ کر ٹھکرا دیا۔ ایسی لڑکی جمیل کو شبانہ کے محبوب کے روپ میں دیکھ کر یقیناً اپنے سوچنے کا انداز بدل دے گی۔

رضوانہ جیسا کردار ہمارے معاشرے کا ایک المیہ کردار ہے۔ ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جنہیں زندگی میں دکھ ہی دکھ ملتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں ہمیشہ اپنی آگ میں سلگتی ہیں اور دوسروں کے لئے قربانیاں دیتی ہیں۔

آپ میری یہ تحریر رضوانہ تک پہنچا دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس تحریر کی روشنی میں دانشمندانہ فیصلہ کریں گی اور یہ مثال قائم کریں کہ عورت دوسروں کی خوشیوں کے لئے ہمیشہ کانٹوں پر چلتی ہے۔

"آپ جس مقصد کے لئے کہانی چھپوانا چاہتی تھیں۔ وہ مقصد اس خط کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں پاکیزہ پڑھنے والی بہنوں کو کبھی مایوس نہیں کرتی یہی کوشش کرتی ہوں کہ کسی نہ کسی طرح ان کے کام آتی رہوں۔ سو آپ کے کام آرہی ہوں۔"

فقط۔

آپ کی بہن ساجدہ معراج

خط پڑھنے کے بعد فرزانہ کے دماغ میں جیسے دھواں سا بھر گیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ پڑھ کر دل کو ٹھیس پہنچی تھی کہ کالج کی میگزین میں شائع ہونے والی مصنفہ کو خوشامدانہ تعریفوں سے بھرپور خط لکھنے کے باوجود پاکیزہ کے صفحات میں جگہ نہیں ملی تھی۔

ایسے وقت ہر لکھنے والی کو اپنی توہین کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی تحریری خامیاں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ صرف رسالے کی مدیرہ مغرور نظر آتی ہے۔ فرزانہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ پاکیزہ کی مدیرہ خود کو دنیا کی قابل ترین مصنفہ سمجھتی ہے اور دوسروں کی کہانیوں میں خواہ مخواہ کمزوریاں تلاش کرتی ہے۔ مشورے بھی دیتی ہے۔ باجی کے سامنے خط ہی پیش کرنا ہوتا تو کیا میں طویل کہانی لکھنے کی بجائے ایک خط ہی نہ لکھ دیتی۔ آخر اس خط میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ باجی پڑھتے ہی متاثر ہو جائیں گی۔

اس نے بڑی بے دلی سے خط کو میز کے ایک گوشے میں پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگی۔ اسی وقت اسے اپنی امی کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے کمرے میں کسی سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھیں انداز ہی ایسا تھا جیسے کسی سے جھگڑا کر رہی ہوں۔ فرزانہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس کی امی کہہ رہی تھیں۔

"فرحانہ! میں نے ہزار بار سمجھایا ہے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکیوں کو نہیں بولنا چاہیئے مگر تم ہو کہ بے شرموں کی طرح بولے چلی جاتی ہو۔"

فرزانہ کے قدم رک گئے۔ یہ بات فوراً ہی سمجھ میں آگئی کہ اس کی باجی نے مدتوں کی خاموشی توڑ دی ہے اور اب کھلم کھلا اپنی شادی کی بات چھیڑ رہی ہیں۔

فرزانہ اس کے کمرے میں جانے کی بجائے دوسری جانب کھڑکی کے پاس آگئی اور چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ اس کے ابو کہہ رہے تھے۔

"بیگم تم خواہ مخواہ فرحانہ پر بگڑ رہی ہو۔ ہمیں اس کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ جمال بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہم بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ فرحانہ بھی اس کی حمایت کر رہی ہے لیکن بات تو اسی وقت بنے گی جب جمال کے والدین یہاں رشتہ مانگنے آئیں گے۔"

"وہ آئیں گے ابو۔" فرحانہ نے پورے وثوق سے کہا۔ "میں خود ہی جمال سے کہوں گی کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ اپنے والدین کو رشتہ طے کرنے کے لئے یہاں بھیج دیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ جمال صاحب کبھی انکار نہیں کریں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے والدین کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور جلدی سے قدم بڑھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ فرزانہ اپنی باجی کی باتیں سن کر جیسے سکتے میں آگئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی جلدی بازی پلٹ جائے گی۔ وہ تدبیریں کرتی رہی اور باجی نے اپنا فیصلہ سنا بھی دیا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

وہ خاموش تھی۔ مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کے والدین کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ باجی جمال سے منسوب ہونا چاہتی ہیں۔ لہٰذا اب باجی کی غلط فہمی دور کرنے کا مطلب یہی ہوتا کہ دونوں بہنیں اپنے والدین کے لئے مسئلہ بن جاتیں۔ اب تو دل پر پتھر رکھ کر جمال کو سمجھانا تھا کہ تدبیر پر عمل کرنے سے پہلے ہی تقدیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ لہٰذا اسے اپنے وعدے کے مطابق یہاں آکر باجی کا رشتہ مانگنا چاہیئے۔

وہ سوچتے سوچتے اپنے کمرے سے آگے نکل گئی اور اپنی باجی کے دروازے پر آگئی۔ اب تو یہی ہو رہا تھا۔ وہ ایک بات سوچتی تھی۔ دوسری بات ہو جاتی تھی۔ ایک جگہ جانا چاہتی تھی دوسری جگہ پہنچ جاتی تھی۔ اس کی باجی پلنگ پر دوسری طرف منہ کئے بیٹھی تھیں۔

فرزانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فرحانہ کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی اور آہستگی سے بولی۔

"باجی! ایک روز میں نے کہا تھا کہ جب تک جمال صاحب اس دروازے پر آپ کا رشتہ مانگنے نہیں آئیں گے میں خوشی کا اظہار نہیں کروں گی۔ آج میں بہت خوش ہوں باجی کہ آپ انہیں اپنے رشتے کے لئے یہاں بلا رہی ہیں۔ میں آپ کو........."

اسی وقت فرحانہ نے پلٹ کر دیکھا تو فرزانہ کی آواز رک گئی۔ اس کی باجی کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا مگر وہ مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

"نادان لڑکی! تمہیں نادانی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں جمال صاحب کو یہاں اپنے رشتے کے لئے بلا رہی ہوں؟ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنا منحوس سایہ تم دونوں کی خوشگوار زندگی پر پڑنے دوں گی۔ میں ابھی امی اور ابو سے تمہارے اور جمال کے رشتے کی باتیں کر رہی تھی۔"

فرزانہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جو کچھ سن رہی ہے۔ وہ حقیقت ہے۔

وہ آگے بڑھ کر باجی کے پاس بیٹھ گئی اور جھجکتی ہوئی بولی۔

"بب۔ باجی۔ آ۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا جمال صاحب نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے؟"

"نہیں۔ جمال صاحب نے کچھ نہیں بتایا۔ میں انہیں ایک ذہین انسان سمجھتی تھی۔ مگر وہ بھی تمہاری طرح نادان نکلے۔ کیا میں اتنی خود غرض ہوں کہ تم دونوں کی خوشیاں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تم لوگوں نے حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر وہ چھپ نہیں سکی۔ وہ حقیقت ایک مدیرہ کے خط سے ظاہر ہو گئی۔"

فرزانہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور تب اسے یاد آیا کہ اس کی میز پر وہ لفافہ پہلے سے کھلا رکھا ہوا تھا۔ یعنی اس سے پہلے ہی باجی نے اس خط کو پڑھ لیا تھا۔ وہ یکبارگی اپنی باجی سے لپٹ گئی۔

"باجی۔ مجھے معاف کر دیجئے باجی۔ میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی۔"

"تم یہ چاہتی تھیں کہ مجھ سے تمہارا دل دکھتا رہے۔ پگلی کہیں کی۔ ایسے اہم فیصلے ہمیشہ ذہانت سے کئے جاتے ہیں۔ اس مختصر سے خط نے مجھے ساری باتیں سمجھا دی ہیں۔ کبھی کبھی ایک خط' ایک خوشبو بن کر ذہن کو معطر کر دیتا ہے۔ یہ خوشبو مجھے نئے خواب دکھا رہی ہے۔ عورت کی بزرگی' بہن کے لئے ممتا' اپنے لئے خودداری' دوسروں کے لئے ایثار کا جذبہ۔ کتنی ہی خوشبوئیں ہیں جو مجسم ہو کر عورت بن جاتی ہیں۔"

وہ رو رہی تھی۔

فرزانہ اس کی گود میں منہ چھپائے مسکرا رہی تھی۔

ایک کو رونا تھا۔ دوسری کو ہنسنا تھا۔

وہ دونوں بہنیں تھیں۔ ایک قہقہوں کی ریشمی انگلیوں سے تراشی گئی تھی۔ دوسری آنسوؤں سے گوندھی گئی تھی۔

☆======ختم شد=====☆